مرزا ادیب بی اے (آنرز)

کے افسانوں کا مجموعہ

غلاموں کی بغاوت

اور دوسرے افسانے

ناشر

چودھری محمد شفیع

پروپرائیٹر کتب خانہ اردو۔ موچی دروازہ لاہور

پہلی مرتبہ ۱۰۰۰

قیمت عہ

فہرست

افسانہ	نمبر صفحہ

اپنی رفیقۂ حیات کے نام

ماہِ جون سنہ ۱۹۳۷ء

"ارضِ سامین" کے شمالی حصے میں، جہاں پہاڑوں کا سلسلہ ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے سرے کی لامتناہی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے ظالم سردار "صولت" کے چند غلام الاؤ کے گرد بیٹھے، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے جسموں کو حرارت پہنچا رہے تھے۔ پہاڑی علاقہ اور پھر صبح کا وقت، وہ سردی تھی کہ الاماں! تیز و تند ہوا کے جسم خراش جھونکے زرد زرد شعلوں کو تھپیڑے لگاتے، چہروں پر نشتر زنی کرتے انسانی زندگی کے لئے ناقابلِ برداشت اذیت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ بدنصیب غلام کبھی اپنے چہرے آگ کے بالکل قریب لے جاتے۔

اور کبھی سیاہ رنگ پاؤں شعلوں پر رکھ دیتے۔ آہ! وہ اپنے لرزتے ہوئے، کانپتے ہوئے جسموں کو شعلوں ہی کے سپرد کر دینا چاہتے تھے ـــــ شعلوں ہی سے لپٹ جانا چاہتے تھے۔

ان میں ایک چھوٹا سا لڑکا بھی سمٹا سمٹایا، دبکا دبکا یا بیٹھا تھا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، پھر ایک غلام نے آگ سے گرم ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا "ایسی ذلیل زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے، معلوم نہیں قدرت کس بات کا ہم سے انتقام لے رہی ہے۔ خونخوار بھیڑیا خدا کا قہر ہے۔ مظلوموں کی آہیں اور بددعائیں آج تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔"

"قدرت کے انتقام کو شکست دینا انسانی طاقت سے باہر ہے" دوسرے نے کہا اور ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ قریب سے ایک آواز "خونخوار بھیڑیا" کہتی ہوئی سنائی دی، تمام کھڑے ہو گئے اور گرتے پڑتے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ دو تین منٹ کے بعد الاؤ کے پاس صرف ایک بوڑھا اور لڑکا رہ گئے۔ ایک تو پہلے ہی وہ شدتِ سرما سے کانپ رہے تھے۔ اب مذکورہ بالا الفاظ سن کر، اور اپنے ساتھیوں کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ بوڑھا پہاڑ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بوڑھے کمزور ہاتھ برف جیسے سرد پتھر پر لرزنے لگے۔ سرد جھونکے اس کے جھری دار نیلے پیلے گوشت میں سے خنجر کی طرح گزر گزر کر، کمزور ہڈیوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ لڑکا بھی اس کے قریب کھڑا تھا۔ بوڑھے نے بچے کو دیکھ کر کانپتے ہوئے لہجے میں کہا "سہیل ـــــ یہاں سے بھاگ ـــــ جاؤ"

"کہاں بابا؟" لڑکے کے لبوں سے نکلا

"کہیں ـــــ چھپ جاؤ ـــــ جلدی کرو خونخوار بھیڑیا آ رہا ہے۔"

پاؤں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ لڑکا بھاگ کر ایک طرف چلا گیا۔ ایک آدھ منٹ

گزر نے کے بعد ضعیف انسان نے سامنے دیکھا ـــــ وہ سُرخ، غضب ناک اور شعلہ ریز آنکھیں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ اور اپنی نگاہیں ایک ٹیلے پر جما دیں۔ اسے ایسا محسوس ہُوا۔ کہ زمین پہاڑوں کو اپنے سینے پر اٹھائے عمیق گہرائیوں میں ڈوب رہی ہے۔

ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی وہ ٹیلا جس پر اس نے نگاہیں جما رکھی تھیں۔ دھوئیں کے ایک کثیف بادل کی طرح دو آتشیں شعلوں میں غائب ہو گیا وہ خونخوار آنکھیں اس کے چہرے کے قریب آگئی تھیں "کیوں بوڑھے باجی! یہاں آگ تاپ رہے ہو" صولت نے گرج کر کہا۔

"حضور! میں بوڑھا ـــ بوڑھا......" آگے وُہ کچھ نہ کہہ سکا۔ آواز اس کے حلق میں اٹک گئی اور وُہ اپنے ظالم آقا کے چہرے پر صرف ملتجیانہ نظریں ڈال کر رہ گیا۔

"تم کام کرنا نہیں چاہتے باجی"...... یہ کہتے ہوئے صولت نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اپنا ہاتھ ایک خادم کی طرف بڑھایا۔ خادم نے چابک اس کے ہاتھ میں دیدی۔ بدقسمت بوڑھے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صولت اور چابک کو دیکھا۔ آخری بار اس کی التجا انگیز نگاہوں نے زبانِ خاموشی سے بھیڑیے کی شعلہ ریز نظروں سے رحم کی بھیک مانگی۔ اور اپنے ہاتھ صولت کے ہاتھوں کی طرف بڑھائے۔

"شاں" کی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جھری دار ہاتھ پر چابک کا نشان اس طرح نظر آنے لگا جس طرح جلے ہوئے جنگل پر دھوئیں کی ایک کثیف چادر چھائی ہوئی ہو۔ ظلم کی مشین اپنا کام کرنے لگی اور ضعیف جسم کی کھال پرزے پرزے ہونے لگی۔ ظالم سردار کے لئے اس قسم کے ظلم کا مظاہرہ روزمرہ کا معمول تھا۔ قدرت نے اسے پیدا ہی اس لئے کیا تھا

کہ وہ بے کس انسانوں کی کھال اُدھیڑے۔ کمزور مخلوق کے سینے کو اپنے پاؤں کے نیچے کچلے اور خلقِ خدا کے خون سے ہولی کھیلے، کونسی سفاکی تھی جس سے اس کے خونخوار دل نے پرہیز کیا تھا۔ کون سا ستم تھا جس سے اس کا دامنِ حیات بے داغ تھا؟

آج سے نو سال پیشتر اس نے "ارضِ سایمن" پر بے کسی کی حالت میں قدم رکھے تھے۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی تھے۔ شبانہ روز محنت کے بعد وہ غاروں میں سے چند چمکتے ہوئے ٹکڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ صولت کی زندگی کی پہلی کامیابی تھی، اس کے بعد اس کی دولت کے انبار میں اضافہ ہونے لگا۔ اور جیسے جیسے اس کی طاقت بڑھتی گئی، اس کے مظالم بھی بڑھتے گئے۔ اسے ظلم سے کون روک سکتا تھا؟ "ارضِ سایمن" ایک مختصر سا علاقہ تھا تین طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ـــــ آبادی سے کوسوں دُور۔

صولت کا جہاز سال میں ایک مرتبہ ہیرے اور جواہرات لے کر روانہ ہوتا تھا۔ اور کچھ مدت کے بعد علاوہ ضروریاتِ زندگی کے چند ان بدنصیب انسانوں کو بھی لے آتا تھا جنہیں صولت یا اس کے ساتھی لالچ وغیرہ دے کر جہاز میں سوار کر لیتے تھے۔ صولت ان بدبختوں کو زرخرید غلام سمجھتا تھا۔ اور ان پر ایسے ایسے ظلم کرتا جن کا تصور بھی ایک "مہذب ذہن" میں نہیں آ سکتا۔

صبح سے لے کر شام تک یہ بیکس غلام ہل چلا کر اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز کرتے۔ اور بڑے بڑے پتھروں سے اس کے عالیشان مکانات تیار کرتے۔ اگرچہ ہر ایک غلام مشقت کے بارِ گراں کے نیچے کچلا جا رہا تھا۔ اس پر بھی اگر کوئی شکوہ کرتا یا چند منٹ کے لئے آرام لیتا۔ تو ظالم صولت کی چابک سے اس کی کھال اُدھڑنے لگتی۔ ظالم صولت کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس کی حد و دل لگی ہو سکتی ہے

"ارضِ ساہین" میں اس کے دو نام تھے، ایک محترم آقا اور دوسرا خونخوار بھیڑیا۔ ہر ایک شخص اس کے سامنے اسے محترم آقا کہتا اور ہر ایک غلام اس کی عدم موجودگی میں اسے خونخوار بھیڑیا پکارتا —— وُہ یقیناً خونخوار بھیڑیا تھا۔ انسانیت کا گوشت کھانے والا، بیکسوں پر پے در پے ظلم ڈھانے والا، سفاک، ظالم، خونخوار بھیڑیا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور ہر دن کے گزرنے پر اس کی خونخوارانہ خو میں ترقی ہو رہی تھی۔ وقت بیت رہا تھا۔ اور وقت کے ہر لمحے پر مظلوموں کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

مظلوم بوڑھا گر پڑا، اس کے جسم سے خون نکل نکل کر جم گیا تھا۔ مگر ابھی تک بھیڑئے کے سفاک دل کی آتش تشنگی نہیں بجھی تھی۔ اس کے ساتھی چپ چاپ یہ درد انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ مظلوم غلام پشت اور سروں پر بھاری بھاری پتھر اٹھائے گزر رہے تھے، کسی میں جرأت نہیں تھی۔ کہ اس ظالم کا ہاتھ پکڑ لے۔ کسی میں یہ حوصلہ نہیں تھا۔ کہ بوڑھے کو درد انگیز موت کے منہ سے بچالے۔ صولت کو "الہ ظلم" سمجھا جاتا تھا۔ اور الہ ظلم کے لاتعداد مظالم نے بندگانِ بیکس کے ضمیروں کو مُردہ، دماغوں کو سمجھنے سوچنے سے قاصر اور دلوں کو بے حس بنا دیا تھا۔

بوڑھا مر چکا تھا۔ اور اَب صولت دوسرے غلاموں کو دیکھ رہا تھا۔

"کمزور و ضعیف انسان کو مر ہی جانا چاہیئے۔" صولت نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

"ہاں محترم آقا! جب وُہ مشقت ہی نہیں کر سکتا۔ تو اس کی زندگی کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"اور پھر ہماری حکم عدولی!"

"آپ درست فرماتے ہیں محترم آقا! ضعیف انسان کو ضرور مر جانا چاہیئے۔" دوسرے ساتھی نے کہا۔

صولت مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنے لگا۔ بوڑھے کی خون آلود لاش وہیں پڑی تھی۔ غلام پتھر اٹھائے جا رہے تھے ——— ننھا لڑکا سہیل کہیں چھپا ہوا تھا۔!

(۲)

سہیل جھونپڑی میں پھٹا پرانا، میلا کچیلا لحاف اوڑھے سوکھے ہوئے گھاس پر کروٹیں لے رہا تھا۔ خوفناک خواب جو اس نے رات کے ابتدائی حصے میں دیکھے تھے اس کے دل و دماغ پر خوف و دہشت طاری کر رہے تھے۔ کبھی تو وہ محسوس کرتا کہ صولت نے اس کی گردن کو دبوچ رکھا ہے اور کبھی اپنے بابا کی بیرحمانہ وسفاکانہ موت کا دہشت ناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا۔ یہ دہشت انگیز منظر دیکھتے ہی وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ ننھا سا دل، ناتجربہ کار دماغ اور یہ ہولناک خواب۔ آخر کار وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ جھونپڑی میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بیمار غلام اندر داخل ہوا۔

"رو کیوں رہے ہو سہیل؟" اس نے سہمے ہوئے بچے کے پاس آکر کہا۔

"ڈر لگتا ہے"! سہیل نے کہا۔

مریض نے آہ بھری اور پدرانہ شفقت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"میری گود میں سو رہو۔"

"میں چچا کے پاس جاؤں گا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"تمہارا چچا ابھی آجائے گا۔"

چند منٹ تو سہیل خاموش رہا۔ پھر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ طوعاً کرہاً بیچارے مریض نے سہیل کو گود میں اٹھایا اور جھونپڑی کے باہر آ کر چلنے لگا۔ کچھ دیر وہ چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک شخص اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور اجنبی چپ چاپ واپس چلا گیا۔ مریض پھر چلنے لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی ـــ دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آیا۔

"یہ چچا چچا پکار رہا ہے۔" مریض نے سہیل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اسے کیوں لے آئے ـــ خیر" دروازہ کھولنے والے شخص نے کہا اور سہیل کو اندر لے گیا۔

جھونپڑی میں ایک پتھر کے اوپر مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی مدھم روشنی ایک چھوٹے سے گوشے میں تاریکی کو چوس رہی تھی۔ پتھر کے پاس سہیل کا چچا کھڑا تھا۔ اور پتھر کے اردگرد چھ سات غلام بیٹھے تھے۔ اس کا چچا کہہ رہا تھا۔

"یہ تو تم پر واضح ہو گیا کہ ہم یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ظالم بھیڑیے نے ہمارا خون چوس لیا ہے اور اب اس کے ظالم دانت ہماری ہڈیوں میں پیوست ہو رہے ہیں۔ کون سا ستم ہے جو اس نے نہیں کیا؟ کون سا ظلم ہے جو اس نے نہیں توڑا؟ ہم خون پسینہ ایک کر کے اس کے کھیتوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے باغات کو پھلوں سے بھرتے ہیں۔ اور اس کے شاندار مکانات بناتے ہیں۔ مگر اس محنت و مشقت کا عوض کیا ملتا ہے؟ یہی کہ ہماری کھالوں کو ادھیڑا جاتا ہے۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھانے کو ملتے ہیں، اور رہنے کے لئے ایسی جھونپڑیاں دی جاتی ہیں۔ جن میں ذلیل کتے بھی سانس لینا گوارا نہ کریں

آج ہمیں اس چیز کا فیصلہ کرنا ہے۔ کہ اسی طرح ذلیل کتوں کی مانند زندگی بسر کرنا ہے یا آزاد رہ کر جینا ہے۔"

ننھا سہیل ایک گوشے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کا چچا کہے جا رہا تھا:۔

"بے حس مظلوم کی زندگی ایک قابلِ نفرت اور ایک قابلِ لعنت زندگی ہے۔ کیوں کہ بے حس مظلوم ہی ظالم کو ظلم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر مظلوم ظلم نہ سہے۔ تو ظالم کیونکر ظلم کر سکتا ہے؟ یہ ہماری بزدلانہ خو کا نتیجہ ہے۔ کہ خونخوار بھیڑیے کی خونخواری بڑھتی جا رہی ہے"......

اس کا لہجہ پُرجوش ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"آج تک تم آہوں اور آنسوؤں کے کمزور ہتھیاروں سے ظالم صولت پر حملہ آور ہوتے رہے ہو۔ مگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکے —— اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، آنسو پانی کے معمولی قطرے ہیں اور آہیں ہوا کی حقیر لہریں، کیا تم ان ہتھیاروں سے چٹان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکتے ہو؟ —— اگر تم اس چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر پہاڑ کی قوت پیدا کرو۔ یاد رکھو۔ تم نے آج تک صولت کے ظلم برداشت کر کر کے اس کی سفاکانہ خو کی پرورش کی ہے —— تم خود اس کی ذلیل غلامی پر قانع رہے ہو —— اگر قانع نہ رہتے تو آج غلام کیوں ہوتے؟ یاد رکھو، غلامی انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ بے حس غلام انسانیت کے دروازے پر ایک ذلیل کتا ہے۔ جسے اس دروازے پر اس وقت تک دھتکارا جاتا ہے۔ جب تک وہ غلام ہے۔ ذرا سوچو، کیا آج تم غلام بن کر کتوں سے بھی زیادہ ذلیل نہیں ہو؟"

سب کی گردنیں فرطِ شرم سے جھک گئیں؛

"غلامی انسانیت سوز ذلت اور مظلومیت لئے ایک طرف کھڑی ہے۔ اور دوسری

طرف آزادی، زندگی کی رُوح، زندگی کی شادابی اور زندگی کی عزّت و حرمت لئے تمہاری منتظر ہے۔ بتاؤ کس طرف جانا چاہتے ہو؟"

"آزادی، آزادی!" غلاموں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہا۔

"تو چلو آزادی کی طرف!"

"ہم تیار ہیں" مجمع نے پرجوش لہجے میں کہا۔

مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟" یہ الفاظ اس شخص نے کہے جس نے سہیل کے لئے دروازہ کھولا تھا۔

سہیل کا چچا ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ اس کی آواز اور پُرجوش ہو گئی۔ "تمہارے جسموں میں صرف ظلم برداشت کرنے ہی کی قوت ہے۔ ظلم کو روکنے کی قوت نہیں تمہارے بازو صرف زخمی ہونا ہی جانتے ہیں، تلوار اٹھانا نہیں جانتے ـــ تم ......"

"نہیں، نہیں"۔ مجمع نے جواب دیا۔

"تو پھر بہادر جوانوں کی طرح زندگی اور موت کا فیصلہ کرو۔ زندہ رہو تو آزاد رہ کر، ورنہ غلامی کو مٹاتے ہوئے مٹ جاؤ۔"

مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا "یہ درست ہے کہ ہم انتہائی ظلم برداشت کر رہے ہیں مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؛ قدرت ہی نے ہمیں ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

اتنا سنتے ہی صفدر کی آنکھیں فرطِ رنج و غصہ سے اور سُرخ ہو گئیں، وہ ایک قدم اور بڑھ آیا اور کہنے لگا "قدرت نہ کسی کو غلام بناتی ہے۔ اور نہ کسی کو آزاد کرتی ہے۔ انسان کی قسمت کا فیصلہ اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی زندگی کا فیصلہ قدرت کو سونپ دینا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے ـــ حالات نہیں بدلا کرتے، انسان بدلا کرتے ہیں جو شخص

آزاد ہونا چاہتا ہے، وہ آزادی کے لئے جنگ کرتا رہیگا۔ یہاں تک کہ موت اس کے اور اس کے مقصدِ زندگی کے درمیان دیوار حائل کردے ۔۔۔ انسان کی زندگی اصول کی زندگی سے وابستہ ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے، مگر اس کا اصول زندہ رہتا ہے۔ اور یہی انسانیت کا انتہائی عروج ہے۔ یاد رکھو! انسانیت کی جبین خون کے انہی قطروں سے چمکتی ہے۔ جو آزادی کی راہ میں بہائے جاتے ہیں۔ ہم سے پہلے جو لوگ یہاں آئے اور اپنی زندگی کو ظالم صولت کے جور واستبداد کے سپرد کر دیا۔ ہم انہیں بزدل کہتے ہیں۔ اگر ہم بھی غلامی پر قانع رہ کر ظلم برداشت کرتے رہے۔ تو آنے والے لوگ ہمیں صرف ایک ہی لفظ سے یاد کریں گے اور وہ ہے بزدل۔ تم صولت کے ظلم برداشت کرکے اپنے اوپر ہی ظلم نہیں کر رہے بلکہ آنیوالے لوگوں پر بھی ظلم کر رہے ہو ۔۔۔ اپنے ہونے والے بچوں پر ظلم کر رہے ہو۔ وہ تمہیں کیا کہیں گے۔ وہ تمہیں کس نام سے یاد کریں گے؟"

مجمع کا جوش بڑھ گیا تھا ۔۔۔ سب کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں خوش ہوں کہ تم نے انسانی مقصد کو سمجھ لیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ صولت کا چہرہ دیکھتے ہی تم پہ لرزہ تو نہیں طاری ہو جائے گا؟ جان کے خوف سے کوئی ذلیل حرکت تو نہیں کر بیٹھو گے؟ اور اس پر حملہ کرنے کی بجائے تمہارے بازو شل تو نہیں ہو جائیں گے؟"

"ہرگز نہیں ۔۔۔ ہم صولت پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس وقت تک علیحدہ نہیں ہوں گے جب تک کہ اس کے خون کا آخری قطرہ بھی خاک پر نہیں بہ جائے گا۔" ایک غلام نے بپھرتے ہوئے شیر کی طرح گرج کر کہا۔

"مگر ہتھیار"؟ دوسرا غلام بولا۔

"یہ مانا کہ ظالم اپنے ظلم کو زندہ رکھنے کے لئے مظلوم کو بے دست و پا کر دیتا ہے۔ مگر اس

پر بھی مظلوم آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ تمھارے پاس خنجر نہیں، تلواریں نہیں، مگر فصلوں کو کاٹنے والی درانتیاں تو موجود ہیں ـــــ چھوٹے چھوٹے چاقو تو موجود ہیں۔ اگر تمھارا جذبہ خلوص حاصل کر چکا ہے۔ تو تم انہی ہتھیاروں سے ظلم کو مٹا سکتے ہو ـــ اور اگر غلامی پر قانع رہنا چاہتے ہو۔ تو ساری دنیا کے ہتھیار بھی تمھارے لئے حقیر تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بس اب زیادہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ جو شخص آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس پرخار راستے پر قدم رکھے۔"

"ہم سب تیار ہیں" ـــ مجمع بیک آواز بولا

"تو آؤ عہد و پیمان کریں۔ کیا تم میں سے ہر شخص حلف اُٹھانے کے لئے تیار ہے کہ میں ظلم کو مٹا دوں گا"

ہر شخص نے آگے بڑھ کر یہی الفاظ دہرائے۔ اب سہیل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ آگے بڑھ کر یہی الفاظ کہے ـــ مگر اس کے قدم جمے رہے نہ معلوم کیوں۔

"صبح جب تم پہاڑ پر تنکے اٹھانے جاؤ تو اپنی اپنی آستینوں اور کپڑوں میں ہتھیار لے جاؤ۔ میں اس پر حملہ کروں گا۔ اس وقت تم بھی اپنا فرض ادا کرنا۔ بس یہ ہے پروگرام۔ اور یقین رکھو کل صبح ہماری نئی زندگی کی صبح بھی طلوع ہو گی۔"

"چچا میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں۔" سہیل نے آخر کار آگے بڑھ کر کہا۔

"سہیل! میں تو تمھیں بھول ہی گیا تھا ـــ خبردار! جو کچھ تم نے یہاں سنا ہے کسی سے نہ کہنا۔"

"تو چچا! میں بھی کہوں؟"

"کیا؟"

"میں ظلم کو مٹا دُونگا!"

"ابھی تمھاری باری نہیں آئی" ـــ یہ کہتے ہوئے صعفدر نے سہیل کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اسے گود میں اُٹھالیا" اس چراغ کو بُجھا دو ـــ کل صبح ہماری زندگی کے اُفق پر آزادی کا آفتاب طلوع ہوگا۔"

ایک شخص نے چراغ بجھا دیا اور وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گئے۔

(۳)

مٹی کے ایک چھوٹے سے تودے کے اوپر کھڑا، نگاہیں سامنے گرتے ہوئے آبشار پر جمائے، سہیل رات کے واقعات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں ظلم کو مٹا دوں گا۔" یہ الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ اور وُہ بار بار محسوس کرتا تھا کہ اپنے چچا کے پہلو میں کھڑا ہے۔ اور اُس کے سامنے ہر ایک غلام پتھر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر یہی الفاظ دہرا رہا ہے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا چچا اور دوسرے غلام ظالم صولت کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں مگر یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ کہ خونخوار بھیڑیا ان کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ صولت تمام دنیا کا بادشاہ ہے۔ اور جو شخص اس کا حکم نہیں مانتا وہ فوراً ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے چچا نے اُسے گھر پر ہی رہنے کے لئے کہا تھا۔ مگر وُہ یہاں آکھڑا ہوا تھا۔ اسکی خواہش تھی کہ چچا ـــ کے پاس جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر جب دماغ میں آتشیں شعلے کی طرح یہ خیال آتا کہ وہاں صولت آجائے گا۔ تو اس کا دل دھڑکنے لگتا اور قدم اٹھانا دوبھر ہو جاتا۔ وہ کسی صورت میں بھی صولت سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال ہی سے اس کی رُوح ہوا ہوتی تھی۔

چند منٹ کے بعد وہ تودے سے نیچے اُترا اور اپنی جھونپڑی کی طرف قدم اٹھانے لگا

ابھی وُہ چند قدم چلا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک گرجتی ہوئی آواز آئی، وہ درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ صولت اور اُس کا ساتھی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" صولت نے لڑکے کو خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا سہیل کے تمام بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"بتاؤ!" صولت نے گرج کر کہا۔ اب بھی وُہ خاموش رہا۔

"تم اِس طرح نہیں بتاؤ گے" صولت نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

سہیل کی نگاہوں کے سامنے صولت کی خوفناک شعلہ ریز آنکھیں تھیں اور اُسکی دہشت ناک چابک، وُہ صولت کے استفسار کو بھُول گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ صولت نے کیا پوچھا ہے اور نہ اس میں یہ جُرأت تھی۔ کہ سامنے کھڑے ہوئے ظالم درندے سے استفسار دُہرانے کے لئے کہے۔

"اگر نہیں بتاؤ گے۔ تو میں مار مار کر تمھاری چمڑی اُدھیڑ دُونگا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی بچے نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں ظلم کو مٹادونگا۔"

"کیا کہا؟" صولت نے سہیل کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ درد کی وجہ سے سہیل کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس نے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھائے مگر صولت نے پھر بازو جھنجھوڑا ــــ بچے کی باہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"کیا کہا؟"

"وہ بھی ــــ کہتے تھے۔"...

"وُہ کون؟" یہ کہتے ہوئے صولت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میرا چچا اور — "

"کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا تھا — کہا تھا۔" لڑکا آگے نہ بول سکا۔

"جلدی بولو"

"میں ظلم کو مٹا دوں گا، انہوں نے کہا تھا۔"

"کب"؟

"رات کو"

"وہ کہاں اکٹھے ہوئے تھے؟"

سہیل اس کے جواب میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ صولت نے متفکرانہ اپنی انگلیاں بالوں میں ڈالیں اور لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے محافظ کیطرف مخاطب ہوا۔ "سمجھ گئے معاملہ؟ ذلیل غلام شرارتوں سے باز نہیں آتے، میرے خلاف بغاوت کر رہے ہیں — کمینے۔" اس نے محافظ کو خاص اشارہ کیا اور وہ بعجلت چلا گیا۔ سہیل کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ بہت بڑی مصیبت آنیوالی ہے۔

صولت نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک گنجان درخت کے پاس کھڑے تھے، قریب ہی غلام پہاڑ سے پتھر نیچے لا لا کر رکھ رہے تھے، اور پتھروں کے پاس صفدر کھڑا تھا۔ صولت کی آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ بھویں تن گئیں اور اس نے غیر اختیاری حالت میں بچے کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ بچے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صفدر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صولت نے سہیل کے ہاتھ کو چھوڑ دیا اور آہستہ

آہستہ چلنے لگا۔

غلام بھنبھر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو خاص انداز سے دیکھ رہے تھے۔ صولت نے چابک کو حرکت دی اور ظلم کی مشین ایک غلام پر چلنے لگی۔ یکایک صفدر آگے بڑھا مگر اس سے پیشتر کہ اس کے بازو اوپر اٹھیں صولت کے محافظوں نے اُسے اور دوسرے غلاموں کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔

"ذلیل غدارو! اپنی شرارت کا انجام دیکھ لیا۔" صولت نے نفرت انگیز قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرے خلاف یہ سازش کمینو!"

"کمینہ تو تُو ہے جوان بھیڑیوں کی مدد سے ظلم کر رہا ہے۔" صفدر نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آج بدقسمتی سے ہمارا مقصد ناکام ہا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تیرا ظلم زندہ رہے گا۔"

یہ الفاظ سنتے ہی صولت کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ "تیرے جیسے ہزاروں دیوانے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اور میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔" صولت نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیئے جائیں۔" صفدر نے کہا۔

"گستاخی کی انتہا ہو چکی ہے محترم آقا!" ایک محافظ نے کہنا شروع کیا۔ "ان بچھوؤں کو پاؤں تلے کچل دینا چاہیئے!"

صفدر تڑپ گیا۔

"انسان ہو کر یہ درندگی — یہ کمینگی!" اس نے محافظ کو مخاطب کر کے کہا۔ "تیرا دل

اِس قدر تاریک ہو چکا ہے کہ انسانی ہمدردی کی ہلکی سی لہر بھی وہاں پیدا نہیں ہو سکتی — تیری روح پر ظلم نے اس درجہ قبضہ کر لیا ہے۔ کہ تو انسانیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

محافظ نے منہ پھیر لیا۔

"میں ان کمینوں کو عبرتناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ اِن کے ہاتھوں کو زنجیروں سے باندھ دو۔" صَولت نے محافظوں کو حکم دیا۔

"جو چاہے کر — عنقریب انصاف کی چکی تیری ہڈیاں پیس ڈالے گی — ہمارے ہاتھوں کو جکڑ دے مگر تو جذبۂ آزادی کو نہیں جکڑ سکتا — آج تو ہمیں عبرتناک سزا دے۔ مگر تیری سزا وُہ ہوگی۔ جس سے جہنم کی عقوبت بھی پناہ مانگے۔" صفدر نے کہا — یکایک اس کی نظر ڈر سے کانپتے ہوئے سہیل پر پڑی۔ اَور وُہ صرف اتنا کہہ سکا: "سہیل!" اس کے بعد اس کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ محافظوں نے سب سے پہلے صفدر کو گرا دیا۔ اور اس کی کھال ادھیڑنے لگے۔

سہیل ڈر کر بیہوش ہو گیا۔ غلاموں کے سامنے ان کے راہنما کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ مگر لوہے کی زنجیروں، اَور محافظوں کی آہنی گرفت نے انہیں بالکل بیکس بنا دیا۔ صفدر نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس کے بعد محافظ دوسرے غلاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جب انہیں اس قدر زخمی کر لیا۔ کہ وہ ذرہ بھر بھی حرکت نہ کر سکیں تو ہاتھ روک لئے۔

"یہ ہے ہمارے خلاف سازش کرنے کا نتیجہ — آئندہ جو شخص اس قسم کی ذلیل حرکت کریگا۔ اس کے ساتھ یہی ہو گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ، تم غلام ہو، غلاموں کی طرح زندگی بسر کرو۔"

یہ الفاظ کہہ کر صَولت بپھرا اور بے ہوش سہیل کو ساتھ لانے کا حکم دے کر چلا گیا۔ جس طرح تلاطم کے بعد سمندر کی سطح پرسکون ہو جاتی ہے اس طرح اِس ہولناک منظر کے بعد غلاموں کا جذبۂ بغاوت ٹھنڈا پڑ گیا۔ زخمی جسموں کے اندر دِل بالکل مُردہ ہو گئے، یہ تو انقلاب تھا غلاموں کی زندگی میں، اِدھر سہیل کے دِل میں انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ وُہ صولت کے ایک محافظِ خاص کی محافظت میں پرورش پا رہا تھا اور اس کے سپرد صرف ایک کام تھا۔ اور وُہ تھا جاسوسی، جیسے جیسے وُہ غلاموں کی خبریں محافظ کے کانوں تک پہنچاتا تھا۔ محافظ کی نظرِ عنایت اس پہ زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اسی طرح دِن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔

سہیل اب مظلومیت کی بادِ سموم کے تھپیڑے کھاتا ہُوا غنچہ نہیں تھا بلکہ وُہ صولت کی بہار پرور عنایتوں کے سائے تلے گلِ خنداں کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس کی عمر چودہ سال کی ہو گئی تھی اور اپنے فرائض ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے کرتے وُہ صولت کے اکرامِ خاص کا مستحق ہو چکا تھا۔ جب کبھی اسے اپنے بابا اور چچا کی بیرحمانہ ہلاکت کا خیال آتا، تو اس کے دِل پر سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔ اس کے ضمیر میں خلش پیدا ہو جاتی۔ مگر اسی اثنا میں صولت کی کرم فرمائیوں اور موجودہ مسرتوں کا سیلاب آتا اور دِل کی چبھن اور ضمیر کی خلش کو بہا کر لے جاتا ——— اور وہ جیبر جاسوس سہیل بن جاتا ——— صولت کا وفادار ——— غلاموں کے لئے ظالم،

ترقی کرتے کرتے اس نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ سب غلام اسے صولت کا بیٹا سمجھتے تھے۔ اسی اثنا میں اس کی زندگی کے افق پر نئی مسرت کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسے کائنات کا ذرہ ذرہ مسرتوں سے لبریز نظر آنے لگا۔ اس کی رُوح ہر وقت سحر انگیز نغموں کے

آغوش میں تیرنے لگی ــــــ صولت کی اکلوتی بیٹی پہلے اس پر مہربان تھی، مگر اب اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

(۴)

متواتر مظالم برداشت کرتے کرتے غلاموں کی قوتِ احساس مُردہ ہو جاتی ہے۔ وُہ اپنی مظلومیت کو قسمت کا لکھا، اور ظالم کے ظلم کو منشائے ایزدی سمجھنے لگتے ہیں مصیبتوں سے نجات پانے کا اگر کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہے تو وہ موت ہے، ان کے بزدلانہ جذبات ہر ایک انسانی کوشش کو حقیر گردانتے ہوئے ظلم سے بچنے کے لئے صرف موت ہی کا دامن پکڑتے ہیں۔ اور صولت کے غلاموں کی زندگی بھی اسی حقیقت کا اعلان کر رہی تھی۔

سہیل ہر روز بیکس غلاموں کی گریہ زاری، چیخ پکار سنتا تھا۔ لرزہ خیز سے لرزہ خیز واقعات کو ہر وقت دیکھتا تھا مگر مظلوموں کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے بے حد دور تھا۔ مسرتوں کے آغوش میں سانس لینے والی زندگی، دُکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا کیونکر خیال کر سکتی ہے، مگر اس دن سہیل خلافِ معمول متفکر تھا۔ اس دردناک واقعے نے جو ایک دن پیشتر اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا اس کے دِل کو بے حد متاثر کیا تھا اور واقعہ یہ تھا کہ ایک غلام عورت نے کھیت کا کام چھوڑ کر اپنے بیمار شیر خوار بچے کو اپنی چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ جب ظالم صولت نے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکلنے لگیں، انتہائی بے رحمی سے کام لے کر وہ بیکس ماں کو بید سے مارنے لگا۔ ظالم نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ ننھے بچے کو زمین پر گرا دیا۔ ماں نے اسے فوراً اٹھا لیا اس پر صولت کے غصے کی انتہا نہ رہی اور اس نے ننھی جان کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ ماں

کی مامتا یہ ظلم کیونکر برداشت کر سکتی تھی؛ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھی اور بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کتے اس سے لپٹ گئے اور اسے لہولہان کر دیا۔ وہ اپنے لختِ جگر کی جان بچانے کے لئے بھاگی اور جب اس کی زخمی ٹانگوں نے بالکل جواب دے دیا۔ تو وہ بچے کے اوپر لیٹ گئی، کتوں نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ خونخوار بھیڑیا اور اس کے درندہ صفت محافظ اس منظر کو دیکھ دیکھ کر خاص لطف حاصل کر رہے تھے۔ سہیل کے دل پر سخت چوٹ لگی وہ بھاگ کر وہاں پہنچا مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ ماں کی مامتا اپنا فرض ادا کر چکی تھی، اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ خون میں شرابور بچہ گنتی کے سانس لے کر ماں سے جا ملا۔ رات کو سہیل سو یا۔ تو خواب میں بھی یہی دردناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اور جب صبح اٹھا۔ تو اس کی طبیعت بے حد مضطرب ـــــ بے حد بے قرار تھی، اس کی مسرور زندگی میں یہ پہلی خلش تھی۔ جو برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی منور زندگی پر غم کا یہ پہلا سایہ تھا۔ جو متواتر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا اور میدان میں کھڑے ہو کر اپنی موجودہ زندگی کا جائزہ لینے لگا۔

جب آگ جلائی جاتی ہے۔ تو شعلے دھوئیں کی کثیف چادروں کے سینوں کو چیرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح تاریکی کے نیچے سوئی ہوئی ضمیر کی قوت شعلوں کی طرح لہرا لہرا کر بیدار ہو رہی تھی۔ "یہ ظلم و ستم کیوں اور کب تک؟ صولت کو ظلم کرنے کا کیا حق ہے۔" یہ سوال بار بار اس کے ذہن اور دل سے ٹکراتا تھا۔ کبھی تو موجودہ مسرتوں کا خیال اس کے تمام احساسات کو کچل ڈالتا تھا۔ اور کبھی ضمیر کی طاقت اسے خود سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی تھی، زرینہ کے عشق کی مسرتوں نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور غلاموں کی مظلومیت نے اس کا دوسرا ہاتھ۔ کشمکش سے تنگ آ کر وہ آگے بڑھا اور ایک چشمے کے

کنارے کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی سے ایک دِل نواز آواز آئی —— اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زرینہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"کس خیال میں ہو تم؟" زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیوں آگئیں؟"

"تم جو یہاں تھے۔"

"مگر تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

"معلوم ہونے والی چیز معلوم ہو جایا کرتی ہے۔"

"زرینہ"! سہیل نے ذرا کرخت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کل جو ظلم ہوا ہے وہ جانتی ہو؟"

"میں نے وہ واقعہ سُنا ہے۔" لڑکی نے غمگین لہجے میں کہا۔ "کاش میں وہاں ہوتی۔"

"تو پھر کیا ہوتا؟"

"میں کبھی یہ ظلم نہ ہونے دیتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ سہیل کے دل میں ایک نشتر سا چبھا۔ وُہ وہاں تھا۔ مگر اس کے باوجود ظلم ہوا۔

"نہ معلوم ابا اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہیں؟" زرینہ نے درد انگیز لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ کوئی ان کے ظلم کو روکنے والا نہیں۔"

"میں انھیں سمجھاتی ہوں، مگر ——"

"وُہ کسی کی نہیں سنیں گے —— وہ کسی کی نہیں سن سکتے —— ان کے کان بالکل بہرے ہیں۔"

"سہیل!" زرینہ نے اس خلافِ توقع اظہارِ رنج پر کہا۔ "تمہیں وہ بہت عزیز سمجھتے ہیں تم پر تو وہ کسی قسم کا ظلم نہیں کرتے۔"

"درست ہے۔ مجھے وہ بہت عزیز سمجھتے ہیں ۔۔۔ مجھ پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتے۔ اسلئے مجھے ان کے خلاف حرفِ شکایت لب پر نہ لانا چاہیئے۔"

سہیل کے لہجے میں طنزیہ رنگ غالب تھا۔ دو تین منٹ کامل خاموشی طاری رہی زرینہ سہیل کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اور سہیل خیالات میں غرق، یکایک زرینہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"سہیل، ایک بات کہوں؟"

"کہو!"

"اس غلام عورت زینب کو جانتے ہو ۔۔۔ وہی جو ہمیں کہانیاں سنایا کرتی ہے۔"

"ہاں آگے کہو"

"کل اس نے مجھے ایک کہانی سنائی ہے۔ جس میں ایک مرد نے اپنی محبوبہ کو دھوکا دیا۔ اور ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا ۔۔۔ پہلی عورت نے زہر کھا کر جان دے دی۔"

"تو پھر؟"

"میں نے اس قسم کی اور بھی کہانیاں سنی ہیں۔ جس میں مردوں نے عورتوں سے بیوفائی کی ہے ۔۔۔ میرے سہیل، تم تو ان مردوں میں سے نہیں ہو نا؟"

سہیل نے زرینہ کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کا دل بیتاب ہو گیا۔ اور اس نے ہاتھ محبوبہ کی گردن میں حمائل کر کے

کہا۔" یہ خیال نہ کرو زرینہ ، ہماری محبت کامیاب رہے گی۔"

"مگر میں ڈرتی ہوں۔"

"ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں"

"اچھا قسم کھاتے ہو؟"

"قسم کھانے کی ضرورت کیا ہے، تمہارا باپ ظالم ہونے کے باوجود ہماری محبت کے لئے ظالم نہیں۔"

"مگر مجھے خوف ہے مبادا تم ظالم ہو جاؤ۔"

"یہ نہیں ہوگا —— زرینہ"

"تو آؤ حلف اٹھائیں کہ ایک دوسرے سے وفا کریں گے۔"

سہیل کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ گردش خون میں تیزی آگئی۔ اُسے گزشتہ واقعات یاد آنے لگے۔ سب سے پہلے وہ منظر اس کے سامنے آیا۔ جب وہ بچہ تھا اور چچا کو ملنے کے لئے جھونپڑی میں گیا تھا اور ہر ایک غلام کی زبان سے سنا تھا " میں ظلم کو مٹا دونگا۔" اس منظر کے بعد دوسرا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہ منظر وہ تھا جب اس نے جھونپڑی میں اپنے چچا اور دیگر غلاموں سے غداری کی تھی۔ اسے وہ واقعہ بھی یاد آگیا۔ جب اس کے چچا نے اپنی بےرحمانہ موت سے پہلے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔" سہیل!" چند لمحوں میں اس کی یاد اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔

"حلف اٹھا کر کہو میں وفا کرونگا۔" زرینہ نے کہا

سہیل کے سامنے " میں ظلم کو مٹا دونگا " کے الفاظ شعلوں کی صورت میں تڑپے اور اُس کے کانوں میں "سہیل" کہتی ہوئی ایک آواز آئی

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"یہیں"؟ وہ مسکرائی "ہم یہاں محبت کے عہد و پیمان کریں گے۔"

"مگر ٹھہرو"

"کیوں؟" لڑکی نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"میری طبیعت خراب ہے، اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو!"

"پہلے جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔"

"میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"تمہاری طبیعت خراب ہے میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"زرینہ مجھ پر اعتبار کرو!"

"مگر مجھے یقین دلاؤ۔"

"کیونکر؟"

"جو میں کہتی ہوں وہ کرو ـــ حلف اٹھا کر کہو میں محبت میں وفا کرونگا۔"

"اتنی ضد اچھی نہیں!"

"تمہارا اس سے کیا بگڑتا ہے؟" زرینہ نے سہیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ایک دم سہیل کے سامنے وہی مناظر یکے بعد دیگرے آئے۔ اس کے کانوں میں بار بار یہ الفاظ گونجے "میں ظلم کو مٹا دونگا" اس کے ساتھ ہی اس کے چچا کی "سہیل" کہتی ہوئی آواز آئی۔ اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ یک لخت زرینہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے سہیل کے ہاتھ کو زور سے دبایا "سہیل! سہیل!!"

سہیل خاموش کھڑا رہا۔

"سہیل!"

اب اس نے زرینہ کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"کیا کہا ہے میں نے؟"

"تم؟" زرینہ کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔

"کیا کہا ہے میں نے؟"

"گویا تم نہیں جانتے۔ کونسا ظلم تم مٹانا چاہتے ہو؟"

"اوہ میں سمجھا۔" اب سہیل کو معلوم ہوا کہ اس نے پتھر پہ ہاتھ رکھ کر وہی الفاظ دہرائے تھے جو غلاموں نے کہے تھے۔

مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ میری طبیعت بہت خراب ہے — میری زرینہ! میری اچھی زرینہ!"

زرینہ نے اشک ریز آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں اور چپ چاپ چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد سہیل جتنا ان واقعات پر غور کرتا، اس کے دل کا اضطراب سینے کی خلش اور روح کی بیقراری بڑھتی جاتی، وہ نگاہِ تخیل کے سامنے دیکھتا کہ بیکس زخمی ماں اپنے ننھے سے بیمار بچے کو گود میں اٹھائے کتوں کے آگے بھاگ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی صولت کا سفاک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ وہ اس اضطراب انگیز اور خلش اندوز حالت سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر نہیں نکل سکتا تھا۔ آخر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر اس دھڑکن میں ایک خاص قسم کی لذت تھی،

زرینہ اپنے باغیچے کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اسے دو دن سے سہیل نہیں ملا تھا۔ اس لئے اُس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ یکایک اس کی داہنی طرف چند قدم کے فاصلے پر ایک شاخ کو حرکت ہوئی۔ اس نے ادھر دیکھا اور خوف و حیرت کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔ سہیل کے کپڑوں پر سرخ داغ پڑے تھے۔ اور آنکھیں خوفناک ہو گئی تھیں۔ زرینہ چند لمحے تو اسے پہچان ہی نہ سکی۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ خوف و حیرت نے اس کے لبوں پر مہر ثبت کر دی تھی۔

"تم سہیل"؟

"تمہیں حیرت ہو گی۔۔ واقعی یہ حیرت کا مقام ہے، لیکن۔۔۔"

"اس وقت تم کیا بنے ہو۔۔ تمہارے ہاتھ خون آلود۔۔؟"

"ایک قاتل کے ہاتھ خون آلود ہی ہونے چاہئیں!"

"تم قاتل؟"

"قاتل بننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا زرینہ!"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔۔ قاتل تم؟ کس کو تم نے قتل کیا، کہو سہیل؟"

"اس شخص کو جس کی نظروں میں انسان ذلیل کتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے جس کے مظالم سے انسانیت کا سینہ زخموں سے چور چور تھا۔"

"کون؟" زرینہ کی نگاہوں کے سامنے تاریک سائے منڈلانے لگے، ایک خوف آلود توقع اس کے ذہن میں چھا گئی۔ ایک حیرت پرور مایوسی اس کے دل پر قابض ہو گئی، اس توقع، اس مایوسی کے درمیان اس کی حالت اس کشتی کی طرح ہو گئی۔۔ جو دریا کی متلاطم سطح پر ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ہچکولے کھا رہی ہو۔ "کون"؟ اس نے دوبارہ کہا۔

"تمھارا باپ ـــ خونخوار بھیڑیا"۔

"میرا باپ ؟؟"

"تمھارے باپ کے سوا اور کون خونخوار بھیڑیا ہو سکتا تھا؟"

"کیا کہہ رہے ہو سہیل ؟ ـــ پاگل ہو گئے ہو ؟"

"ہاں مجھے میرے ضمیر نے پاگل ہونے پر مجبور کر دیا"۔

"مگر ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ تم اور میرے باپ کو ـــ اپنے آقا کو ـــ ؟؟"

"اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا"۔

" زرینہ بُت بنی کھڑی رہی۔

" شاید تم میری بات پر اعتبار نہیں کرتیں۔ حالانکہ میرے خون آلود ہاتھ تمھیں اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے ظالم صولت کو قتل کر دیا ہے ـــ میں نے ظلم کو مٹا دیا ہے۔

"کتنا ظلم ـــ کتنی دغابازی"

" دل کھول کر لعنت ملامت کرو، مگر پہلے میرے چند الفاظ سن لو زرینہ ! تم جانتی ہو کہ صولت نے غلاموں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے پائے استبداد کے نیچے مظلوم زندگیاں کچلی جا رہی تھیں، وہ ظلم کرتا جاتا تھا اور اس کے ظلم کی پیاس بڑھتی جاتی تھی۔ اور ہماری کوئی کوشش غلاموں کو اس کے دستِ تظلم سے نہیں بچا سکتی تھی، اس کی مرض کا علاج صرف ایک تھا اور وہ تھا موت"۔

"تم اور میرے باپ کے قاتل !"

" ہاں زرینہ ! میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں۔ ظلم کو مٹانے کے لئے مجھے یہ انتہائی

ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا۔"

زرینہ چپ چاپ کھڑی سہیل کو دیکھتی رہی۔

"اب میں جاتا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے رخصت" یہ کہتے ہوئے سہیل نے قدم اٹھائے۔ اور باغیچے سے نکل کر چلا گیا۔ زرینہ بے اختیار دروازے پر آ کر اسے دیکھنے لگی۔ سہیل تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

زرینہ نے دوڑ کر اس کا دامن پکڑ لیا۔ "سہیل"

"زرینہ! میں نے ایک ناخوشگوار فرض ادا کر دیا ہے۔ اب دوسرا ادا کرنا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ موقعے کی نزاکت مجھے زیادہ ٹھیرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"تم جا رہے ہو تو میرا کیا ہوگا۔ میں کیا کروں گی؟"

"میں نے تم سے بے وفائی کی ہے مگر زندگی کی مسرتیں تم سے بے وفائی نہیں کریں گی۔"

"میری زندگی کی مسرتیں تو تم لئے جا رہے ہو۔"

"میں قاتل ہوں زرینہ! مجھے اپنے انجام کی طرف جانے دو۔ تمہارے محافظ و خادم بیکس غلاموں کو اس جرم کے مرتکب سمجھ چکے ہوں گے۔ اس حالت میں میرا یہاں ٹھہرنا کتنا خطرناک کام ہے۔"

"تم نہیں جا سکتے!"

"تو پھر؟"

"تم نہ جاؤ۔ تم۔ آؤ ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا زرینہ! مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو!"

"اس وقت محبت کا فرض ادا کرو۔"

"مگر انسانیت کا فرض ہے ۔ انسانیت کا فرض کیونکر ادا ہو گا ؟ ۔۔۔ نہیں میں نہیں جا سکتا ۔ میں یہ بزدلانہ کام ہرگز نہیں کرونگا ۔"

" مگر سنو سہیل ! جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ، اب آؤ یہاں سے چل دیں ۔"

" مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو زرینہ ! تمہارے خادم غلاموں پر ظلم کر رہے ہونگے ۔"

" وہ ظلم نہیں کر سکتے ۔ وہ ظلم نہیں کریں گے ۔ تم مجھ پر ظلم نہ کرو ۔۔۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی ۔"

" یہ خیال خام ہے اِسے دماغ سے نکال دو ۔"

" میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے ۔۔۔ مجھ پر کیوں ظلم کرتے ہو ۔" زرینہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں ۔

" زرینہ ! تمہیں ایک قاتل سے ہرگز محبت نہیں کرنی چاہیئے ۔ اور پھر میں قاتل بھی تمہارے باپ کا ہوں ۔"

سہیل نے غور سے زرینہ کے چہرے کو دیکھا اور چلنے لگا ۔ چند قدم چلا ہو گا کہ پھر زرینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔

" زرینہ ! یہ بات مجھے پسند نہیں ، تم میرے اور میرے فرض کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو رہی ہو ۔"

" تو کیا مجھے مار ڈالنا ہی چاہتے ہو ۔ اگر یہ بات ہے تو مجھے قتل کر دو ۔ میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونا تمہاری فرقت میں گھل گھل کر مرنے سے زیادہ پسند کرتی ہوں ۔"

سہیل کے آگے زرینہ کی اشک آلود آنکھیں رحم کی درخواست کر رہی تھیں ۔ ایک منٹ تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا ۔

"آؤ، سہیل یہاں سے چل دیں۔"

سورج طلوع ہو چکا تھا اور اُس کی روشنی کائنات کے ذرّے ذرّے کو منور کر رہی تھی۔ زرینہ برابر منت و سماجت کر رہی تھی۔

"زرینہ! اس کا کچھ فائدہ نہیں — تمہاری التجا مجھے فرض ادا کرنے سے نہیں روک سکتی۔ مجھے بہرحال اپنا فرض ادا کرنا ہے۔"

"تو محبت کا فرض؟"

"میں نے محبت کے فرض پر انسانیت کے فرض کو ترجیح دی ہے۔"

سہیل نے اپنا بازو چھڑا لیا اور دوڑنے لگا۔ زرینہ "سہیل سہیل" کہتی گرتی پڑتی اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔ اس کے پاؤں زخمی ہو رہے تھے۔ مگر وہ برابر بھاگی چلی جا رہی تھی۔

(۵)

میدان میں ظالم صولت کے محافظ و خادم ایک ایک غلام کو زنجیروں سے باندھ کر، چابک سے پیٹ رہے تھے۔ مظلوم انسانوں کے جسموں سے خون بہ رہا تھا۔ اور فضا میں اُن کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے صولت کو زخمی کر دیا ہے صولت کی موت پر پردہ ڈالا جا رہا تھا۔ یکایک دوسری طرف سے گرد و غبار اٹھا اور سہیل تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا آیا اور ایک دو منٹ میں محافظوں کے پاس پہنچ گیا۔

"ٹھہرو!" سہیل نے بلند آواز میں کہا۔

محافظوں کے ہاتھ رک گئے

"ان کتوں نے محترم آقا کو زخمی کر دیا ہے۔" محافظ بولے۔ غلاموں نے سر ہلا ہلا کر "نہیں نہیں" کا شور مچایا۔

"صولت کو میں نے قتل کیا ہے۔"

سہیل کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی مجمع پر سنسنی چھا گئی۔ "صولت کا قاتل میں ہوں۔" غلام آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ محافظوں کی نگاہیں اس کے خون آلود ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں۔ سہیل ایک تودے پر چڑھ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہنے لگا۔

"صولت ایک خونخوار بھیڑیا تھا اور آج وہ مر گیا ہے۔ اب تمام غلام آزاد ہیں۔"

غلاموں کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"میں نے اُسے قتل کر دیا ہے، انسانوں پر ظلم کرنے والا کبھی زندہ" ـــــ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا ایک محافظ نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ غلام تڑپ کر اٹھے۔ سہیل نے سینے سے خنجر نکالا، اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرا ہاتھ زخم پر رکھ کر کہنے لگا

"بیٹھے رہو، کوئی ہنگامہ نہ ہو، آج سے تم آزاد ہو۔ تم پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ ظلم کرنیوالا مر گیا ہے......" ایک طرف سے "سہیل سہیل" کہتی ہوئی آواز آئی، سہیل آگے بولتا گیا۔ "کنارے پر جہاز کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے ـــ جاؤ تم آزاد ہو۔"

مگر غلام مغلوب الغضب ہو چکے تھے۔ برسوں سے سویا ہوا جذبہ انتقام بیدار ہو چکا تھا وہ ایکدم اُٹھے اور محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہجوم میں "سہیل سہیل" کہتی ہوئی آواز آئی سہیل نے ایک طرف دیکھا۔ اس کی محبوبہ مغلوب الغضب لوگوں میں پس رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بول نہ سکا۔ اور دھم سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی زرینہ کی آواز بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

ماں

ماہ جنوری ۱۹۳۵ء

"بیٹی اچھی؟"

یہ آواز ایک عالیشان عمارت، اسمٰعیل بلڈنگ کے دروازے کے پاس بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑی ہوئی، ایک برقعہ پوش عورت کے لبوں سے نکلی اور اس کے قریب کھڑی ہوئی سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی، ایک کمسن لڑکی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"کیوں اماں؟"

"جاؤ بیٹی! اندر چلی جاؤ، یہاں بہت سردی ہے۔"

لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹی رہی۔ یہ بدنصیب

عورت شہر کے مشہور و معروف دولتمند تاجر شیخ اسمٰعیل کی بیوی آمنہ تھی۔ اور یہ اس کی بیٹی اصغری۔

آج سے آٹھ سال پیشتر، آمنہ اپنے غریب والدین کے گھر میں نہایت خوش و خرم تھی، زندگی کے تلخ و صبر فرسا حقائق سے بالکل ناواقف، اور زمانے کے دل شکن و روح گداز حادثات سے محض ناآشنا۔ اس کی نگاہ میں زندگی عبارت تھی ایک غیر مختتم مسرت سے، اور دنیا نام تھا ایک ایسی جگہ کا، جہاں مسلسل خوشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ دیہات کا وہ گوشہ جہاں اس کی مسرور زندگی گزر رہی تھی۔ اس کے لیے جنت الفردوس سے کسی حالت میں بھی کم نہ تھا۔ صبح کے وقت رات کے جھوٹے برتن مانجھنے کے بعد جب وہ اپنی سادہ طبیعت سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر، قہقہے لگا لگا کر چکی پیستی تو اپنے دل میں ایک ایسی مسرت محسوس کرتی جسے دولتمندوں کی فراوانی دولت بھی حاصل کرنے سے یکسر قاصر تھی، دیہات کی سادہ و سنولی میں اسے، ہر وقت مسرت ہی کے قہقہے گونجتے ہوئے سنائی دیتے تھے۔ اس کی زندگی بذات خود ایک قہقہہ تھی جس نے دیہات کی ایک سادہ مزاج لڑکی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اسکی خوشیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ جب جوانی کا آفتاب افق حیات کی پیشانی پر طلوع ہوتا ہے۔ تو سادہ سے سادہ زندگی بھی ایک دلآویز خواب بن جاتی ہے ۔۔۔ ایک دلآویز خواب رنگین ۔۔۔ آمنہ نے بھی منزل شباب میں قدم رکھتے ہوئے خود کو نئی مسرتوں کے آغوش میں پایا۔ اور جب اس کی منگنی شہر کے بہت بڑے رئیس اور اپنے چچا کے بیٹے اسمٰعیل سے قرار پائی تو خاندان کا ہر ایک فرد فرط مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ آمنہ اس قدر خوش نصیب ہوگی۔ اسمٰعیل کا باپ ایک نہایت کامیاب تاجر تھا۔ جفاکشی، ایمانداری اور لگاتار تگ و دو

نے اس کے کاروبار کو بہت فروغ دیا تھا۔ اور انہی خصوصیات کی بنا پر اس کا ہر اقدام کامیاب
رہتا تھا۔ وہ نیک مزاج و خلوص کیش تھا۔ اس لئے آمنہ کے والد کی درخواست کو رد نہ کر سکا
اور دیہات کی اس سادہ مزاج لڑکی کو ——— اپنی بہو بنانا منظور کر لیا۔ آمنہ کے ارد گرد
منگ، شادی شدہ عورتیں تھیں جنہیں وہ اپنے سے زیادہ مسرور پاتی تھی۔ اب جبکہ وہ خود
اس منزل پر قدم رکھنے والی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ شہر کی زندگی کو دیہات
کے لوگ جنت کی زندگی سمجھتے ہیں، آمنہ کو جب اس زندگی کا خیال آتا۔ تو اس کے دل میں
ایک اضطراب انگیز مسرت یا ایک مسرت انگیز اضطراب دوڑنے لگتا۔ اور جب سہیلیوں کے ساتھ
گاگر اٹھائے وہ پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر جاتی اور پہلے گاگر بھرنے کے لئے اصرار کرتی۔ تو وہ
اس کی گاگر پکڑ لیتیں اور مسکرا کر کہتیں۔ ارے تو تو یہاں چار دن کی مہمان ہے، پھر بھی ہم سے لڑتی
ہے۔" وہ مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ حیا کی سرخی اس کے چہرے پر چھلک جاتی۔ وہ سب سے
آخر میں گاگر بھرتی اور چلنے لگتی۔ تمام راہ رنگین امیدوں کے پرتو سے جگمگاتے ہوئے مستقبل کا
تصور، نشے کی ایک لہر بن کر اس کے دل و دماغ پر طاری رہتا۔ بظاہر وہ سہیلیوں کی گفتگو کو برا
مناتی مگر اس کے دل میں یہی خواہش ہوتی کہ ان کی گفتگو ختم نہ ہو۔ منگنی کے دو سال بعد یہ دیہاتی
لڑکی، دیہات کی جھونپڑی سے نکل کر شہر کی ایک محل نما عمارت میں پہنچ گئی۔ حجلۂ عروسی کی
فضا خوشبو سے مہک رہی تھی۔ وہ اس وقت شاندار پلنگ پر گٹھڑی کی صورت میں بیٹھی ہوئی،
عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ ہر طرف رنگ برنگ کے برقی قمقموں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
پلنگ پر پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ اس نے پھولوں کے رنگین ہاروں کو دیکھا اور خود بخود شرما
گئی، اس کی نگاہوں کے سامنے دولہا کا پھولوں میں گھرا ہوا مسکراتا ہوا چہرہ پھرنے لگا۔
اس نے اپنے عین سامنے دولہا کے چہرے کو دیکھا۔ پھر وہاں سے اس کی نظریں ہٹ کر

.... پھولوں پہ پڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا رنگین خواب روشنی سے ٹکرا کر پھولوں کی صورت میں بکھر گیا ہے۔ ہر قدم کی آہٹ پر اس کا دل دھڑک جاتا تھا، اور وہ شرما کر، لجا کر رہ جاتی تھی۔ اس کا دولہا آیا۔ محبت کے فوری جذبے میں مرد عورت سے وفاداری کا کیا کیا وعدہ نہیں کرتا، اسمٰعیل نے بھی اس کے ساتھ محبت کے عہد و پیمان کئے۔ حیاتِ ازدواجی شروع ہوئی اور نہایت مسرور کن و نشہ آور کیفیت میں شادی کے آغاز میں عورت خود کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہے کیونکہ مسرت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ مگر حیاتِ ازدواجی کی یہ مقدس مسرت بہت جلد غائب ہو جاتی ہے۔ آمنہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ رنگین تصورات خاکِ نامرادی میں منہ چھپانے لگے۔ اور خوشی درخت کی ٹہنی سے ٹوٹے ہوئے ایک حقیر پتے کی مانند، جو ظالم جھونکوں کا مقابلہ کرتا ہوا شاخوں سے بے سہارا، البتہ ہوا چند لمحوں میں زمین پر گر پڑتا ہے، مفقود ہو گئی —— اس کے خاوند کی حالت بالکل بدل گئی شہری زندگی کے تصنعات میں پرورش پائے ہوئے، امیرانہ تربیت حاصل کئے ہوئے مرد کی تمناؤں خواہشوں کو، دیہات کی ایک سادہ مزاج عورت کیونکر پورا کر سکتی تھی، اور نہ پورا کر سکنے کی حالت میں کیونکر اپنی زندگی کی لڑکھڑاتی ہوئی مسرتوں کو سنبھال سکتی تھی؛ نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور جو ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اسمٰعیل اس سے متنفر ہو گیا۔ اور اس سے گریزاں رہنے لگا۔ ایک وفا شعار عورت کے لئے اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ اس کا خاوند اس سے نفرت کرے۔ اس سے بھاگے؛ وُہ ہر وقت غمگین رہنے لگی۔ دل ہی دل میں کڑھتی، اور اس کے سوا وُہ کر بھی کیا کر سکتی تھی؛ اس حالت میں اس کی معصوم بچی اصغری اس کے لئے بہت بڑی رحمت ثابت ہوئی۔ اس کی تمام توجہات اس ننھے سے جسم میں کوز ہو گئیں۔ جب ننھی بچی کے لبوں پر معصوم تبسم کھیلتا تو فرطِ محبت کے زیر اثر وُہ بے اختیارانہ

اُسے سینے سے لگالیتی، خوشی سے اس کا سینہ بھر جاتا۔ غم کا تاریک و کثیف بادل جو اس کی رُوح پہ منڈلاتا رہتا تھا۔ اس معصوم کی چمکتی ہوئی پیاری پیاری آنکھوں کی روشنی کے سامنے دُور ہو جاتا۔ خاوند کے ناقابلِ برداشت مظالم کے باوجود وُہ خوش تھی۔ قدرت نے اس کے خاوند کے دل سے محبت چھین لی لیکن اس کے عوض محبت کی یہ جیتی جاگتی تصویر بھیج دی۔

اسمٰعیل کی عشرت پسند اور عیش جُو طبیعت کیونکر خاموش رہ سکتی تھی، وہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی جدید معاشرت کا ساتھ دینے والی اس کی زندگی کا ساتھ نہ دے، ترکش ستم سے آخری تیر نکلا۔ شہر کے ایک دولتمند آدمی کی لڑکی اس کی سوکن کی صورت میں اس کے پاس آموجود ہوئی۔ صورتِ حال دیکھ کر آمنہ کا دل لرز گیا۔ اس نے سنا تھا۔ کہ سوکن بہت ظلم کیا کرتی ہے۔ ایسا ہی ہُوا۔ دُنیا کے ملعون ترین ظلم نے اپنا نشانہ اس دیہاتی عورت ہی کے سینے کو بنایا۔ اب اس کے خاوند کے پاس اس کے لئے صرف ایک چیز رہ گئی تھی اور وُہ تھی بالکل بے پروائی اسکی سوکن کے پاس اس کے لئے صرف ایک شے تھی اور وُہ تھی طعنہ زنی! بیچاری عورت اپنی فریاد کسے سناتی، شادی کے دو سال بعد ہی، اس کا سسر فوت ہو گیا تھا، اب رہ گئے والدین تو ان کے لئے یہ فخر کی بات نہیں تھی۔ کہ ان کی لڑکی بہت بڑے رئیس کے گھر ہے؛ وہ اسی فخر میں مست تھے۔ کاش انہیں اپنی بیٹی کے اس زخم کی خبر ہوتی، جو اس کے سینے میں ہر وقت رستا رہتا تھا۔

بار بار نفرت انگیز قہقہے، ہر وقت دلخراش طعنے، رات دن جھڑکیاں گالیاں، وہ کیا کیا ظلم برداشت نہ کرتی، ظلم بالائے ظلم یہ کہ سوکن اسکی معصوم بچی کو بھی ظالمانہ طور پر مارتی تھی۔ وہ بیچاری اتنا بھی نہ کر سکتی تھی کہ اصغری کو اس ظالمہ کے پنجے سے چھڑائے۔ اس نیت سے جب ذرا آگے بڑھتی تو خاوند اور سوکن دونوں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ "تم لڑکی کو خود بھی

ہدایت نہیں دیتی ہو اور ہمیں بھی منع کرتی ہو۔" یہ تھے سوکن کے الفاظ جو وہ اسے روکنے کے لئے کہتی۔ بیچاری آمنہ خونِ جگر پی کر منہ دوسری طرف پھیر کر خاموش کھڑی رہتی۔ جب سزا ختم ہو جاتی، تو وُہ بچی کو سینے سے لگائے اپنے کمرے میں چلی جاتی، اسے بھینچ بھینچ کر خوب روتی بچی معصومانہ انداز میں کہتی :-

"انہوں نے تمہیں بھی مارا ہے اماں ؟"

"نہیں ...... ب .... بیٹی !"

"تو پھر تم کیوں روتی ہو ؟"

اس کا جواب وہ کیا دیتی — کیا دے سکتی تھی ؛

آج کی شام سے دو دن پیشتر اصغری کا ہاتھ آگ میں جل گیا تھا۔ اس لئے وہ اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھی۔ اب سے ایک گھنٹہ پیشتر وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی حالت پر رو رہی تھی، جب غم و غصہ انتہا کو پہنچ جاتا۔ تو والدین کو کوسنے لگتی جنہوں نے اسے اس اندھیرے کوئیں میں دھکیل دیا تھا۔ یکایک اسے بچی کے رونے کی آواز آئی۔ وُہ بے اختیارانہ باہر نکل آئی۔ سوکن اصغری کو بیرحمانہ پیٹ رہی تھی اور بچی درد سے تلملا رہی تھی، اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سوکن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک تو اس کا ہاتھ جلا ہوا ہے۔ اور دوسرے تم پیٹ رہی ہو، رحم نہیں آتا تمہیں ؛"

"لو دیکھا بڑی ہمدرد آ گئی"۔ سوکن نے اسمٰعیل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہوئی ؟" اسمٰعیل نے پوچھا۔

"مَیں نے اس کم بخت کی بچی کو کہا تھا۔ کہ ذرا گلاس مانجھ دے، کہنے لگی میرا ہاتھ جلا ہوا ہے۔ حالانکہ اس کے ہاتھ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"اندھی تو نہیں ہو، اُس کا ہاتھ تو دیکھو۔" آمنہ نے جل کر کہا۔

ایسا سخت فقرہ اس نے تمام عمر میں پہلی بار کہا تھا۔ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ سامنے کھڑی ہوئی ظالم عورت کے چہرے کو نوچ دے، وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی، کہ سوکن آگ بھبوکا ہو کر بولی

"اندھی ہو تو تیری ماں ...... بے شرم کہیں کی ..... دیہات کی چھوکری ہو کر ہمارے سروں پر چڑھتی جاتی ہے۔"

"تو تو کب بادشاہ کی بیٹی ہے۔" وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا جواب دے۔ فرطِ غصہ و غم سے اسکی زبان بند ہوگئی تھی،

"خاموش رہو بدبخت! میں پوچھتا ہوں، تو اپنی شرارتوں سے کب باز آئے گی؟" خاوند نے اپنی چہیتی بیوی کے اشارے پر کہا۔

"میرا تو اب یہ فیصلہ ہے کہ یا میں رہوں گی یا تمھاری یہ چہیتی بیوی"۔ اس کی سوکن نے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دیہاتی ڈائن واقعی بہت تنگ کرتی ہے۔" اسمٰعیل نے کہا۔

ان الفاظ سے آمنہ پر بجلی گر پڑی

"اگر تو نے اپنی حالت نہ بدلی، تو میں تجھے گھر سے نکال دوں گا۔" یہ اس کا دوسرا فقرہ تھا۔

"اس کا ابھی فیصلہ ہونا چاہیئے۔ میں اس ڈائن کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" سوکن نے لال پیلا ہو کر کہا

"میں ڈائن ہوں؟" آمنہ کے لبوں سے نکلا۔

"اور کیا بلکہ ڈائن سے بھی زیادہ۔"

"تو میں چلی جاتی ہوں۔"

"ہماری جوتی سے!"

آمنہ اپنے کمرے میں چلی گئی، برقعہ پہنا اور باہر نکلنے لگی۔ اسے کامل یقین تھا کہ اس کا خاوند اُسے ایسا کرنے سے روکے گا۔ مگر وہ ظالم بیٹھا رہا۔ ایک لفظ تک اس کے منہ سے نہ نکلا۔ وہ اضطراری کیفیت میں گھر سے باہر نکل گئی۔ اور انتظار کرنے لگی کہ اس کا خاوند یا کوئی آور آئے اور اُسے لے جائے۔ اسی اثنا میں اصغری بھی وہاں آ گئی۔

رات کے نو بجے تھے۔ سردی بلا کی تھی، ہوا کے سرد، جسم خراش جھونکے، نہایت تیزی سے چل رہے تھے، اور اُن کے ہلاکت خیز حملوں کے سامنے وہ بیکس ہستیاں کھڑی تھیں۔ دو بیکس و مظلوم ستم رسیدہ ہستیاں! ان کے سامنے ان کے عالیشان مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر وہ نہیں جا سکتی تھیں، ماں نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس کا دایاں ہاتھ دروازے پر رکھا ہوا تھا۔ گویا وہ خلاقِ عالم سے پوچھ رہی تھی۔ کہ اس دروازے کو چھوڑ کر اب وہ کہاں جائے؟ بچی مستفسرانہ بیکس ماں کو دیکھ رہی تھی۔ آمنہ نے سرد آہ بھری اور دروازے پر نظریں گاڑ دیں وہ انتظار کر رہی تھی کہ کوئی اندر سے آئے۔ اُسے آہنی دروازے پر برقی قمقمے کا ہلکا سا، حلقۂ نور، اس کی کبھی پوری نہ ہونے والی امید پر، ایک خاموش قہقہۂ استہزا بن کر محسوس ہو رہا تھا۔ دائیں بائیں ایک مسلسل قطار میں شاندار کوٹھیاں کھڑی تھیں۔ جن کے خوش قسمت مکین مخملیں لحافوں میں خوابِ استراحت کا لطف اٹھا رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کے قریب دو مظلوم ہستیاں، قدرت کے انتہائی ظلم کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں

تھا جو اُن کی مصیبت کا اندازہ لگاتا۔ ان کی گریہ آور و قابلِ رحم حالت دیکھتا۔ کیسے پڑی تھی کہ اس سردی میں گھر سے باہر نکلے ؛ اچانک اندر سے اسمٰعیل کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی اصغری خوف زدہ ہو گئی، اور یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ جھڑکتا ہوا اسے مارنے کے لئے آرہا ہے۔ ماں کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف تیزی سے بھاگ گئی۔ حیران و پریشان ماں بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ اصغری کچھ دور ایک درخت کے عقب میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ آمنہ نے آواز دی، خوف زدہ بچی خاموش رہی۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ سوتیلی ماں یا باپ سے ڈر کر ایک جگہ چھپ گئی تھی ماں نے آواز دی اور جب وہ آئی تو سوتیلی ماں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ ظلم کا یہ نقشہ اس کی آنکھوں کے آگے پھر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد آمنہ نے معصوم بچی کو کانپتے ہوئے دیکھ لیا۔

"اچھی! تجھے کیا ہوا؟" ماں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ابا جان .... مارنے آرہے تھے۔"

مظلوم عورت کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ آنسوؤں کے نقاب میں سے اس نے خوف اور سردی سے کانپتی ہوئی بیکس بچی کے زرد چہرے کو دیکھا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ وہ اس وقت جی کھول کر رونا چاہتی تھی۔ سیلابِ اشک بہنے کے لئے آنکھوں میں موجزن تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔ معاً اس کے دل میں خیال گزرا، کہ یہ معصوم بچی کیوں اس کے ساتھ سردی کا ظلم برداشت کرے؟ وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگی، کہ کیوں وہ گھر سے باہر نکل آئی۔ آخر میں نے پہلے یہ ظلم برداشت نہیں کئے تھے؟" اس نے دل میں کہا "یہ ذلت و ستم میرے لئے نیا نہیں ...... مگر انہوں نے تو مجھے گھر سے نکال دیا ہے ...... وہ تو مجھے ......" اس نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تاہم وہ رو

کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ اس نے بچی کو گود میں اُٹھا لیا اور گھر کی طرف چلنے لگی۔ بار بار اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اگر نوکروں نے دروازہ بند کر لیا ہو تو پھر؟ دروازے کو دُور ہی سے دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اسکی آخری امید بھی خاک میں مل چکی تھی، دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں دُنیا خون آلود تاریکی میں ڈوبنے لگی، قریب پہنچکر اس نے دروازے پر دستک دی، مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا؟ ماں کو دیکھکر بچی بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھ لوہے پر مارنے لگی۔ مگر پھر درد محسوس کر کے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ آہ! یہ منظر کتنا دردناک، کتنا درد انگیز تھا۔ آمنہ نے آواز دینی چاہی مگر کوشش کے باوجود بھی آواز اس کی زبان سے نہ نکل سکی۔ آخر کار ہلکی سی آواز نبیا کہتی ہوئی اس کے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے نکلی۔ نبیا (گھر کا بوڑھا خادم) وہاں کہاں تھا؟ اس نے ایک اور آواز دی۔ مگر یہ بھی فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے غائب ہو گئی۔ اندر سے کوئی ہاتھ دروازے کی طرف نہ بڑھا۔ آدھ گھنٹہ تک وہ وہاں کھڑی رہی۔ بچی بار بار کہتی "اماں سردی سردی"۔ وُہ اس کے جواب میں اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتی، اس کی بانہیں تھک گئیں۔ ہاتھ درد محسوس کرنے لگے۔ اس کی قسمت کی طرح دروازہ بدستور بند تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ ہوا کا ہر ایک سرد جھونکا، اس کے دماغ کا کوئی نہ کوئی جزو، اس کے دل کا کوئی نہ کوئی حصہ اڑا کے لئے جا رہا ہے۔ اور وہ قبرستان کے زنگ آلود آہنیں دروازے پر زخمی ہاتھ مار مار کر چیخ رہی ہے۔ اُس کے عریاں سینے سے لہو کا ایک قطرہ نکلتا ہے اور وُہ وہیں جم جاتا ہے۔ یکایک اصغری مدھم سی آواز نکالتی ہے۔ اور منظر اسکی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ خون کا یہ منجمد قطرہ اس کی ننھی اصغری ہے۔ جسے اس نے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اسی اثنا میں امید کی ایک کرن اس کی آنکھوں میں چمکی جس کمرے میں بوڑھا نبیا سوتا تھا۔ وہاں سے بھی اندر داستہ [illegible] ھے نے یہ سمجھکر کہ شاید کوئی کتا

دروازے پر پنجے مار رہا ہے۔ "شی اشی" کہا۔ اور ساتھ ہی چھڑی کو زور سے زمین پر مارنے کی آواز آئی آمنہ کو محسوس ہوا کہ وہ زمین کی آخری گہرائی میں جا گری ہے۔ وہ گھر کی مالکہ تھی ـــ وہ اس گھر کی مالکہ بن کر آئی تھی اور آج اسے ایک ذلیل کتا سمجھا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔ کوشش کے باوجود آنسو کا ایک قطرہ بھی اس کی آنکھوں سے نہ نکلا۔ یہ ناامیدی کی، ذلت کی انتہا تھی۔ ذلت اور حقارت، دنیا میں اس کے لئے صرف یہی دو چیزیں رہ گئی تھیں اگر وہ اکیلی ہوتی تو یقیناً کوئیں میں چھلانگ لگا لیتی۔ مگر اس وقت وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سینے سے چمٹی ہوئی ایک ننھی سی ہستی، اپنے ننھے ننھے ہونٹوں سے بار بار، اماں، اماں کہنے والی معصوم بچی، اس کے اس خطرناک ارادے میں حائل تھی۔ اس نے دل کڑا کر کے پھر دروازے پر دستک دی۔ آواز بھی دی۔ اب کے شی کی آواز زور سے آئی۔ وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ چند منٹ ایک جگہ کھڑی رہنے کے بعد، وہ پھر آہنی دروازے کے سامنے کھڑی تھی، کچھ دیر یہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پہلو میں باغیچہ کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ دو تین منٹ میں وہ باغیچے میں تھی، چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بحر بے پایاں میں ڈوب رہی ہے ہر طرف تاریکی ہے۔ ایک طرف سے مگرمچھ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دور بجلی کا قمقمہ اسے مگرمچھ کی آنکھیں بن کر نظر آ رہا تھا۔ قدرت کے ستم کا کون سا تیر تھا جس سے وہ محفوظ تھی۔ وہاں جہاں وہ کھڑی تھی اس کے مکان کی ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ جو اس وقت بند تھی، اور تھی بھی اس سے بہت اونچی بچی لرزتی ہوئی آواز میں کہتی "اماں سردی ـــ سردی" لیکن ماں اسے سینے سے بھینچ لیتی۔ وہ ایک پودے کے پاس بیٹھ گئی ...... اچانک اس کے دماغ میں خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی ہمسائے کے دروازے کو کیوں نہ کھٹکھٹائے، لیکن پھر مایوس ہو گئی، ممکن ہے دروازہ

نہ کھلے۔ اور پھر وہ کہہ کیا سکتی تھی، شرم وحیا اور بے عزتی کا احساس اسے ایسا کرنے پر کبھی رضامند نہیں کر سکتا تھا مجبور ہو کر بے کس عورت باغیچے کے آخری گوشے میں چلی گئی۔ جسم پر شلوار، اور ایک قمیص کے سوا باقی سب کچھ اتار دیا۔ پھر برقعے اور دوسرے کپڑوں میں بچی کو لپیٹا۔ اور اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے جسم کے گرد ہاتھ حمائل کر دیئے۔ پشت دیوار سے لگا دی۔ اور بیٹھ کر سردی کے ہلاکت آور جھونکوں کے درمیان ماں کی ممتا کا آخری ثبوت دینے لگی۔

صبح کے سات بج چکے تھے۔ باغیچے میں آکر مالیوں نے جونہی دور، ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ وہ وہاں تیزی سے پہنچے۔ ایک عورت مردہ پڑی تھی۔ سینے پر کپڑوں کی ایک گٹھڑی کے گرد ہاتھ حمائل تھے۔ ایک مالی نے یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں، اسے جنبش دی، سینے سے ہلکی سی آواز آئی، حیران ہو کر انہوں نے سینے سے کپڑے اتارے، ننھی بچی، اصغری آنکھ ملتی ہوئی، مردہ ماں کے سینے سے علیحدہ ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اماں، اماں کہنے لگی —— آہ! اس کی اماں ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی ــ بیوفا خاوند ...... ابھی تک آرام سے سو رہا تھا۔ اور وفا شعار بیوی کی نگاہیں مر کر بھی مکان کی کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

ماہ اگست سنہ ۱۹۳۷ء

رندرا نے ایک دلربایانہ ادا سے کتاب کو جسے وُہ بہت دیر سے عالمِ استغراق و وارفتگی میں پڑھ رہی تھی بند کر کے ایک طرف صوفے پر رکھ دیا۔ شعلہ گوں رخسار پہ بکھری ہوئی سیاہ زلفوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے ہٹایا اور ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ یہ رنگین داستانِ عشق، یہ دلآویز افسانہ محبت جسے اس نے ابھی ابھی ختم کیا تھا اس کے دل و دماغ کو ازحد متاثر کر رہا تھا۔ اس کے سینے کی گہرائیوں میں ایک لذت آفریں ہلکا ہلکا درد، میٹھا میٹھا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ وُہ چند منٹ اسی حالت میں بیٹھی رہی پھر کسی فوری جذبے کے زیرِ اثر بیتابانہ اُٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر پیانو بجانے لگی۔

دُور گوشہ مغرب میں زرد رُو آفتاب ایک قریب مرگ انسان کی مانند جو زندگی کی حرارت، زندگی کے نور سے لمحہ بہ لمحہ محروم ہو رہا ہو، کائنات پر حسرت بآغوش الوداعی نظریں ڈالتا ہوا غائب ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھڑکی کی راہ سے اندر داخل ہو ہو کر دیواروں اور ریشمی پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر مدھم سی آواز پیدا کرتے ہوئے اسی راہ سے واپس جا رہے تھے۔ اندرا کی نازک انگلیاں پیانو کے پردے پر لرز رہی تھیں اور نگاہیں افق بسیط پر رنگین ابر پاروں کے نظارے میں محو۔ یکایک دروازے کے پردے کو جنبش ہوئی اور اس کی بے تکلف سہیلی شیلا مسکراتی ہوئی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی

"کیا ہوا ہے —— تم جب بھی آتی ہو آندھی کی طرح آتی ہو۔" اندرا نے پیانو سے، انگلیاں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"آج سیر کو نہیں چلو گی ؟"

اندرا نے انکار کی صورت میں سر کو جنبش دی۔

"کیوں ؟"

"ہماری مرضی تم پوچھنے والی کون ہو ؟"

"تمھاری مرضی ؟ اور اگر میں مجبور کر دوں تو —— ؟"

"آخر کیوں تم مجھے مجبور کرنے لگیں ؟"

"اس لئے کہ تمہیں ضرور سیر کرنی چاہیئے —— سمجھی ؟" شیلا نے اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے مجھے زبردستی لے چلو۔"

"تو اٹھو !"

"میں خود اُٹھوں تو پھر تمھاری زبردستی کہاں؟"

"میں زیادہ باتیں سننے کی خوگر نہیں ہوں، جلدی چلو آج تمھیں اپنی ایک پرانی سہیلی سے ملاؤں گی۔"

"نہ بہن ایسا ظلم نہ کرنا میں باز آئی تمھاری بڑی پرانی سہیلی سے۔"

"مطلب یہ کہ آج تمھیں مجبور کر کے لے ہی جانا پڑے گا۔"

"نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمھارے مجبور کرنے پر بھی میں آج نہیں جاؤں گی۔"

"وجہ؟"

"وجہ؟ کیا کروں میرا دل یہی چاہتا ہے۔"

"اوہو، میں اب سمجھی" شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا "تمھارا بہانہ معقول ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر سے ایک تصویر اُٹھائی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ "کیا کرے بے چاری دِل کے ہاتھوں مجبور ہے......"

"کیا بک رہی ہو۔"

"کچھ نہیں، دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد......"

"تم شرارت سے کبھی باز نہیں آؤگی؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"کیا کروں میرا دل یہی چاہتا ہے۔"

"اس پر دونوں بے اختیار ہنس پڑیں۔ شیلا نے تصویر رکھ دی اور

ع "دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

گاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کمرے میں شام کی تاریکی بتدریج پھیل رہی تھی۔ اندرا نے اُٹھ کر سوچ دبایا۔ اور میز پر رکھی ہوئی اسی تصویر کو دیکھنے لگی۔ یہ تصویر اس کے منگیتر برج کمار کی تھی۔ برج کمار ایک تعلیمیافتہ متمول خاندان کا چشم و چراغ اور اندرا کی آرزوؤں کا مرکز تھا۔ آج سے ایک سال پیشتر وہ اس سے ملا۔ اور اسی پہلی ملاقات میں دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے تھے۔ ملاقاتوں نے آتش محبت پر تیل کا کام کیا۔ دونوں معاشرت جدید کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اسلئے انہیں آزادانہ ایک دوسرے کو شریک حیات منتخب کرنے میں کونسی رکاوٹ پیش آسکتی تھی؟ آخر ان کی منگنی ہو گئی۔ دونوں کی زندگیاں ساتھ ساتھ چاروں طرف سے نکہت بداماں فضا میں اپنی کامیابی کے کیف پرور و دلآویز ترانے سنتی ہوئی قہقہوں کی آغوش میں انگڑائیاں لیتی ہوئی محبت کے مسرت انگیز راستے پر گامزن تھیں۔ اندرا کو کبھی اس بات کا خیال تک بھی نہ آسکتا تھا کہ دنیا کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی برج کمار کو اس سے جدا کر سکتا ہے۔ برج کمار کے ذہن میں بھی یہ تصور پرتو افگن نہیں ہو سکتا تھا کہ اندرا کسی حالت میں اس سے جدا ہو سکتی ہے۔ دونوں خوش و خرم تھے، دونوں اپنی کامرانی محبت کی شادمانیوں میں مست!

چند لمحات تصویر دیکھنے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر میز کے پاس آکر رُک گئی۔ یہ تصویر، یہ حسین و جمیل شکل، اسے بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی، وہ تصویر کو نہایت غور سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ ایسا کرنے پر اسے دل نے مجبور کر دیا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے پردے سے ٹکرانے پر سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اندرا دروازے کی طرف دیکھنے لگی، پھر ذرا مایوس ہو کر پیانو کے پاس بیٹھ گئی۔ اضطراب میں ملفوف لذت محبت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، اس کی متبسم نظریں میز کے ایک کونے پر جمی تھیں۔ لبوں پر ایک عجیب دلکش مسکراہٹ

لرز رہی تھی۔ یکایک اس کے عقب میں ایک پردے کو جنبش ہوئی۔ اور برج کمار اسکے پیچھے سے نکل کر آہستہ آہستہ چل کر اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ اندرا اپنے خیالات میں غرق تھی۔

"خوب" کمار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اندرا نے گھبرا کر منہ پھیرا اور کمار کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔

"ہو ہو، یہ بات ٹھیک نہیں، اپنا شغل جاری رکھو۔"

"تم آج کہاں غائب رہے ؟"

"بتاتا ہوں، مال روڈ پہ تو تم کئی بار گئی ہو، وہیں ایک کونے میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں آج اسی کے کونے میں چھپا بیٹھا رہا۔ سمجھ گئی نا ؟"

"تو اب کیوں آگئے ہو ؟" اندرا نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ آدمی ایک ہی جگہ غائب رہے۔ آخر تمہارا ڈرائنگ روم کس لئے ہے ؟"

"مگر تم آئے کب ؟"

"جب تمہاری بہیلی آندھی کی طرح یہاں آگئی تھی۔ اسی وقت میں بھی بارش کے قطرے کی مانند ٹپک پڑا تھا۔"

"اور اتنی دیر پردے کے پیچھے چھپے رہے ؟"

"اب تو یہ ماتا کی ویلے سے بہت سمجھدار ہوگئی ہو۔ اتنا بڑا معمہ حل کر لیا۔"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ مجھے آج تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں، چند کتابوں کے متعلق بھی کچھ دریافت کرنا ہے۔"

"اور مجھے بھی تم سے ایک بہت بڑی بات کہنی ہے۔"

"کہو"

"سُنو، غور سے سنو ـــــ نہیں تم غور سے نہیں سُن رہی ہو؟"

"کہتے کیوں نہیں"؟

"کہنا تو چاہتا ہوں، لیکن تم غور سے سننے کے لئے تیار نہیں ہو، خیر میں سناتا ہوں، تاہم میں چاہتا ہوں تم غور سے سنو۔"

"میں کئی بار تم سے کہہ چکی ہوں کہ ہر ایک بات کا مذاق نہ اڑایا کرو۔"

"کیا کروں میرا دل یہی چاہتا ہے۔"

اندرا ہنس پڑی اور کمار بھی ہنسنے لگا۔

"شیلا بڑی شریر لڑکی ہے۔" اندرا نے پیانو کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"افسوس میں تمہاری تائید نہیں کر سکتا۔"

"تو مجھے کیا؟"

"کچھ نہیں، صرف تمہیں تھوڑا سا رنج پہنچے گا۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں کلکتے جا رہا ہوں چار ماہ کے لئے۔"

"کیوں؟"

"فرم کا کام ہے۔"

"مگر تم کیوں جاؤ، اور کوئی کیوں نہ جائے؟"

"اس کا جواب یہ ہے کہ میں کیوں نہ جاؤں اور کوئی کیوں جائے؟"

"تم تو ہر بات مذاق میں ٹال دیتے ہو، حالانکہ یہ عادت ....."

"حالانکہ یہ عادت بہت بُری ہے ـــــ ہے نا؟" کمار نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا

"میں تم سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔"

"بہتر۔۔۔ مگر صرف ایک بات سُن لو، کلکتے میں چار ماہ رہوں گا۔ کیونکہ فرم کا نہایت ضروری کام ہے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن تمہیں خط لکھتا رہوں گا۔ اور تم اچھی لڑکی بن کر جواب دیتی رہنا۔"

"سُن لیا۔"

"تو مہربانی کرکے ایک بات کا جواب بھی دے دو۔ تمھاری سالگرہ کا دن پرسوں ہے یا اترسوں؟"

"پرسوں اترسوں کیا کل۔۔۔۔"

"صرف کل؟"

"ہاں"

"تو کل بھی میں یہاں نہیں ہونگا۔ اس لئے کل کا تحفہ آج ہی دیئے جاتا ہوں۔"

"لاؤ جلدی!"

"کمار نے جیب سے ایک ہاتھی دانت کی صندوقچی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اندرا نے اسے کھولا۔ اور ایک خوشبو میں لپٹا ہوا ریشمی رومال اس کے ہاتھ میں نظر آنے لگا۔"

"بہت بہت شکریہ" اندرا نے رومال کے ایک کونے کو جس پر لفظ ب ک کاڑھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اب مجھے اجازت دے دو۔"

"اگر تم نہ جاؤ تو؟"

"جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ نہ جاؤں۔ مگر کیا کروں، فرم کا از حد ضروری کام ہے۔ اور میرے سوا اور کوئی اسے کر بھی نہیں سکتا۔"

"خط لکھتے رہو گے نا؟"

"یقیناً"

برج کمار اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اندرا نے رُومال کو بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

(۲)

آج شہر کے کامیاب بیرسٹر مسٹر نند لال نے اپنے مخصوص دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ نند بلڈنگ کے ایک عالیشان آراستہ و پیراستہ کمرے میں ہر صنفِ انسانی کے افراد قہقہے لگانے اور سیاسیاتِ حاضرہ پر رائے زنی کرنے میں مصروف تھے۔ جب کوئی نو وارد مہمانوں پر چھلپتی ہوئی نظر ڈالتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا تو ایک ستم ظریف اس پر فقرہ چست کرتا، حاضرین کی متبسم نظریں ایک خاص انداز میں اس پر جم جاتیں۔ پھر فضا میں قہقہے گونجنے لگتے اور بیچارے نو وارد کی مدھم آواز قہقہوں کے سیلاب میں ڈوب جاتی۔ کمرے کے ایک کونے میں برج کمار بھی اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ اچانک دروازے پر نند لال کے پہلو میں نوجوان مصور ہریش چندر کا سنجیدہ چہرہ نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی حاضرین بے اختیار ہنس پڑے۔ مگر وہ تمام کی نکتہ چینیوں اور فقرہ بازیوں سے بے پروا، اپنے چہرے پر غم و غصہ کا ہلکا سا بھی اثر ظاہر کئے بغیر، پوری سنجیدگی، پورے وقار سے قدم اٹھاتا ہوا برج کمار کے پاس آ بیٹھا۔

"کیوں مصور صاحب!" برج کمار نے شرارتاً مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے سُنا

ہے کہ فرانس میں تصویروں کی بین الاقوامی نمایش کے موقع پر آپ کی تصویر کو اس سال کی بہترین تصویر سمجھا گیا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

" یہ بات تو بالکل معمولی ہے۔" دوسرا دوست بولا " اگر ہریش چندر کی تصویر کو بہترین تصویر نہ سمجھا جاتا تو ہمیں ارباب نمایش کی عقل پر ماتم کرنا پڑتا۔ بھلا آفتاب کو کون آفتاب نہ کہے گا؟"

" شاید یہ خبر سول ملٹری میں شائع ہوئی ہے، مگر مصوّر صاحب کو انعام کیا ملا؟"

" انعام ــــ! فرانس کی آدھی سلطنت۔" برج کمار نے کہا۔ اس پر تمام نے قہقہہ لگایا۔

ان تمام چیزوں کے باوجود ہریش چندر نہایت سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

" کیوں مسٹر ہریش! تم خاموش کیوں ہو؟" ایک دوست نے پوچھا۔

" غالباً یہ سوچ رہے ہیں کہ آدھی سلطنت دے کر ارباب نمایش نے میری ہتک کی ہے"

" تو تمھارا مطلب ہے کہ پوری سلطنت انعام میں دینی چاہیے تھی۔"

" بالکل درست۔"

اس کے بعد ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں لیکن ہریش چندر کی سنجیدگی اور وقار میں کوئی فرق نہ آیا۔ کھانا کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونے لگے۔ آخرکار کمرے میں ہریش چندر اور برج کمار کے سوا اور کوئی نہ رہا۔

" ہریش چندر! تم عجیب انسان ہو۔ سنجیدگی بہت اچھی چیز ہے۔ مگر ہر وقت نہیں۔"

" درست ہے۔" مصوّر نے جواب دیا۔

" تو پھر تم خود کو اتنا سنجیدہ کیوں ظاہر کرتے ہو؟"

"نہیں میں خود کو اتنا سنجیدہ تو نہیں ظاہر کرتا۔"

"میرے دوست! بعض انسانوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی نگاہوں میں پُراسرار شخصیتیں متصور ہوں۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر وُہ ہر وقت چہرے پر سنجیدگی کی مسرت کش نقاب ڈالے رکھتے ہیں۔ اپنے مقصد میں وُہ کامیاب تو ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک بڑا نقصان اٹھانے کے بعد۔ اور وُہ نقصان یہ ہے کہ ان کی زندگی ناقابلِ برداشت حد تک تلخ ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی انہیں بیوقوفوں میں سے ہو!"

"نہیں کمار! تمھارا خیال غلط ہے۔ بظاہر میں غمگین نظر آتا ہوں مگر حقیقتاً میں بیحد مسرور ہوں۔ جیسی روحانی مسرت مجھے حاصل ہے اس کا عشرِ عشیر بھی تمہیں میسا نہیں۔"

"میرے دوست! حقیقت اور چیز ہے اور خود کو دھوکا دینا اور شے۔ خیر یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ آج کل تم کون سی تصویر بنا رہے ہو؟ کلکتے سے آنے کے بعد میں تمھاری کوئی نئی تصویر نہیں دیکھ سکا۔"

"ان دنوں تصویریں تو میں نے چند ایک ضرور بنائی ہیں۔ مگر وہ کسی کام کی نہیں۔ میں چند دنوں کے بعد ایک ایسی تصویر بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ جو میرا شاہکار ہوگا۔ فنِ مصوّری اس پر فخر کرے گا۔"

"تمہارا یہ شاہکار کب تک مکمل ہو جائے گا؟"

"تمہیں یا دنیا کو اس سے کیا؟ کیونکہ میرا یہ شاہکار صرف مجھی تک محدود رہے گا۔"

"تم پھر شاعری کرنے لگے۔"

"حقیقت کوئی بھی شاعری کہلاتی ہے؟" ہریش چندر نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ حقیقت ہے، خوب"

"تمہارا کیا ارادہ ہے، یہیں ڈیرا ڈالو گے؟" نند لال نے آکر پوچھا۔

"ہم جا رہے ہیں بھائی! گرم کیوں ہو رہے ہو" برج کمار نے جواب دیا۔ اور دونوں دوست باہر نکل آئے۔ ہریش چندر کا محل وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس لئے وہاں جاتے جاتے خوب تاریکی پھیل گئی۔ آخر کار وہاں پہنچ گئے۔ محل ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ دونوں باغیچے میں سے ہوتے ہوئے محل میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد برج کمار برقی قمقمے کی روشنی میں ایک نہایت دلکش تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس تصویر میں دکھایا گیا تھا۔ کہ سارس کی مادہ زخمی ہو کر آگ کے شعلوں میں گر رہی ہے۔ سارس بھی اس کے پیچھے پیچھے آگ میں کود رہا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ "محبت کی طاقت" — برج کمار دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا۔

"تمہاری یہ تصویر نہایت اعلیٰ ہے — نہایت ہی اعلیٰ"

"یہ کچھ نہیں، وہ تصویر جسے میں بنانے کا ارادہ کر رہا ہوں، میرے کمالِ فن کا پورا پورا مظاہرہ کرے گی۔"

"یہ تصویر ہو گی کیا؟"

"یہ تصویر ایک عورت کی ہو گی —— ایک ایسی عورت کی جو میری دنیائے تخیّل پر حکمران ہے۔ جو میری روح کی تابندگی ہے۔ جس کی ضیائے رُخ سے میری آرزوؤں، امیدوں کی پیشانی درخشاں و دُرخشاں ہے۔"

"ایک خیالی عورت، خبطی ہو تم"

"نہیں خیالی نہیں۔"

"تو اور کیا؟"

"اگر میں نے ثابت کر دیا کہ وُہ خیالی نہیں؟"

"تو کرو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟"

ہریش چندر نے کمرے کے ایک کونے میں سے ایک خوبصورت ڈبیہ نکالی، اسے کھولا اور ایک ریشمی رومال لا کر برج کمار کے سامنے رکھ دیا۔ "لو یہ دیکھ لو۔ یہ رومال میری محبوبہ دلنواز کا ہے۔"

رُومال کو دیکھتے ہی برج کمار کو ایسا محسوس ہوُا۔ گویا وُہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔

"دیکھا یہ میری پیاری محبوبہ کا رومال ہے۔"

برج کمار برابر رومال کو دیکھ رہا تھا۔ اسکی آنکھیں کیوں کر دھوکا کھا سکتی تھیں؟ وہی رومال، وہی کونے پر لفظ ب۔ک کاڑھا ہوُا۔

"یہ رومال والی" ــــ برج کمار کہنے لگا، مگر آگے نہ کہہ سکا۔

"یہ رومال والی میری محبوبہ ہے۔ میری زندگی، میری رُوح کی مالکہ ہے، ہائے ے
اُس سے پوچھئے کوئی چاہت کے مزے۔ جس نے چاہا، اور جو چاہا گیا
"کیوں برج کمار کتنا پیارا شعر ہے۔"

برج کمار کا غم و غصہ کے مارے بُرا حال تھا۔

"تمہیں یہ رُومال ملا کیوں کر؟"

"مل گیا" ہریش چندر نے مسکرا کر کہا۔

برج کمار اُٹھا۔ ہریش چندر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں کیا ارادہ ہے؟"

"میں جاتا ہوں، ایک سخت ضروری کام یاد آگیا۔"

"ضروری کام ہے تو میں تمہیں نہیں روکتا۔" ہریش چندر نے رومال کو تہ کرکے صندوقچی میں رکھتے ہوئے کہا۔

برج کمار کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہریش چندر نے رومال پھر نکالا اور اسے آنکھوں سے لگاکر صوفے پر لیٹ گیا۔

(۳)

برج کمار جب ہریش چندر کے محل سے نکلا تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی شخص تیز نشتر سے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ چند منٹ پیشتر ——— صرف چند منٹ پیشتر وہ خود کو نہایت خوش قسمت انسان تصوّر کرتا تھا۔ اور اب ایک واقعے نے، ایک ایسے واقعے نے، جو سوائے اس کے تمام دنیا کی نگاہوں میں نہایت معمولی ——— نہایت حقیر تصوّر کیا جاتا، اس کی زندگی کو تمام مسرتوں سے محروم کر دیا تھا۔ اس کا دماغ جہنم کدۂ اضطراب بنا ہوا تھا۔ اور دل خلش و بےکلی کی جولانگاہ ——— زندگی کا وہ رنگین، وہ دلآویز خواب مسرت جو ہر لحظہ، ہر گھڑی اس کی نگاہوں پر چھایا رہتا تھا، ابر کے ایک ٹکڑے کی مانند جس کا وجود آہستہ آہستہ بارش کے قطروں میں تحلیل ہو رہا ہو۔ مایوسی کے تاریک پردوں میں غائب ہوتا جا رہا تھا۔ اِندرا ہی اس کے لئے سب کچھ تھی۔ اس کی زندگی کی زندگی، روح کی روشنی۔ اور اب یہ زندگی کی زندگی، یہ روح کی روشنی اس سے چھین گئی تھی۔ ہر قدم کے ساتھ مایوسیوں کا ایک طوفان اس کے دل کو گھیر لیتا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے میں داخل ہوکر سیدھا اندرا کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اور چند لمحوں کے بعد وہ اس کے کمرے میں تھا۔ اندرا ابھی تک

سیر سے واپس نہیں آئی تھی۔ وہ کوچ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ گزشتہ واقعات کی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ یہی وہ کمرہ تھا۔ جہاں محبت کے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ جہاں ایک دل نے اپنی دھڑکن کی زبان سے اپنا سب سے قیمتی راز دوسرے دل تک پہنچایا تھا۔ اور جہاں دو نرگسیں آنکھوں نے آنسوؤں، شفاف قطروں کے جو کھوں میں جڑے ہوئے نقوش محبت کو دوسرے کی نظروں کے سامنے پیش کیا تھا۔ واقعات کی تصویریں اسکی نگاہِ تخیل کے سامنے آ آکر غائب ہوتی جا رہی تھیں آخرکار رومال بھڑکتے ہوئے شعلے کی صورت میں اس کے سامنے ظاہر ہوا۔ اور اس کے ساتھ اندرا حسب دستور مسکراتی ہوئی آ داخل ہوئی۔

"اوہ! آج تم پردے کے پیچھے کیوں نہیں چھپے؟"

"میرا رومال کہاں ہے"؟ کمار نے اس کی بات اَن سنی کر کے کہا۔

"کون سا رومال؟"

"وہی جو میں نے کلکتہ جانے سے پیشتر تمہیں دیا تھا۔"

اندرا کو اس کے تلخ لہجے پر حیرت ہوئی۔ اس سے پیشتر کبھی اس کا لہجہ اتنا تلخ نہیں ہوا تھا۔

"میں نے پرسوں جو کہہ دیا تھا کہ تمہارا دیا ہوا خوبصورت ریشمی رومال کمپنی باغ میں کہیں کھو گیا ہے۔"

"سچ سچ بتاؤ"

"سچ سچ کیا؟"

"اندرا اصل حقیقت بتاؤ، میرا رومال کہاں ہے؟"

"آخر اس رومال میں تھا کیا ؟ بھلا خود ہی بتاؤ، چیزیں گم نہیں ہو جاتیں ؟ وہ بھی گم ہو گیا۔ اور ویسے بھی اس کے کھوئے جانے کے متعلق تمہیں پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ رومال تم نے مجھے دے دیا تھا۔ میں نے اسے کھو دیا۔"

"اندرا! تم زیادہ عرصے تک مجھے دھوکے میں نہیں رکھ سکتیں۔ آخر حقیقت بتا ہی گئیں ؟"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے ؟"

"کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ رومال تم نے ہرلش چندر کو دے دیا ہے ؟"

ان الفاظ کے سنتے ہی اندرا پر قیامت ٹوٹ پڑی وہ تڑپ کر کرسی سے اٹھ بیٹھی۔

"افیم تو نہیں کھا آئے تم ؟"

"افیم نہیں زہر کھا کر آ رہا ہوں! سنا تم نے ؟"

"کچھ سہی مگر تم پر نشہ ضرور طاری ہے۔"

"اگر نشہ طاری نہ ہوتا۔ تو تم ایسی مکار عورت سے دھوکا کیوں کھاتا ؟"

"کمار سوچ کر بات کرو، کیا کہہ رہے ہو مجھے ؟"

"مکّار عورت"

"میں مکّار ہوں ؟"

"بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور چیز......"

"کمار! سوچو تم مجھے کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا نہ ہو بعد میں تمہیں سخت نادم ہونا پڑے۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ درست کہہ رہا ہوں، اور اس کا ثبوت بھی میرے پاس موجود ہے"

"ثبوت ؟ کس بات کا ثبوت ؟"

"یہی کہ مجھے دھوکے میں رکھ کر ہرلیش چند۔ کو چاہتی ہو اور اب تک چاہ رہی ہو۔"

"یہ نہایت ذلیل الزام ہے۔ ایسے الفاظ زبان سے نکالتے وقت تم کو شرم کرنی چاہیئے۔"

"اور تمہیں دھوکا دیتے وقت شرم نہ کرنی چاہیئے۔ کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے کہ میں نے جو رومال تمہیں گزشتہ سالگرہ کے موقعے پر دیا تھا وُہ تم نے اپنے چاہنے والے ہرلیش چند۔ کو نہیں دیا؟"

"نہایت بیہودہ الزام ہے۔"

"تو وُہ رومال اس کے پاس پہنچا کیونکر؟"

"اتنی سی بات پر آپے سے باہر ہو گئے۔" اندرا نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔"میں نے تمہیں پرسوں بتایا تھا کہ کمپنی باغ میں سیر کرتے وقت وہ رومال کہیں گر پڑا۔ اسی وقت یا اس کے بعد کسی شخص نے اٹھا لیا۔ اب بتاؤ، میرا اس میں کیا قصور ہے؟"

"تم جھوٹ بک رہی ہو۔ ہرلیش چند رنے مجھ سے خود کہا۔ کہ رومال والی مجھ سے ملتی ہے وُہ میری محبوبہ ہے۔ تم سمجھتی تھیں کہ میں دھوکے ہی میں رہونگا۔"

"کمار دیکھو، تم بڑھتے ہی جا رہے ہو۔ تمہارا یہ رویّہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے"

یہ کہکر اندرا دروازے کی طرف چلی۔ کمار نے بڑھکر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میری آخری بات بھی سنتی جاؤ۔"

"میں تم سے کچھ سننا نہیں چاہتی تم اس وقت حیوان بنے ہوئے ہو۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی مکار عورت ہو تو میں تمہارے پاس بھی نہ پھٹکتا۔ تم نے محبت کا جواب محبت میں دے کر مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا۔"

"پھر وہی باتیں۔ معلوم ہوتا ہے تمام دنیا کی دیوانگی تمہارے سر میں سما گئی ہے۔"

"مجھے تم نے تباہ کر دیا ہے ــــ افسوس ـــ" وہ کچھ اور کہنے لگا تھا۔ کہ اندرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور رحم طلب نظروں سے اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہے کمار! میں نے کسی کو رومال نہیں دیا۔ میں نہیں جانتی سریندر کون بلا ہے۔ میں تمہاری اندرا ہوں، تمہاری ہی رہوں گی۔ سوچو آج تم نے مجھے کیا کچھ کہہ دیا ہے۔"

"نہیں، اب میں دھوکے میں نہیں رہ سکتا۔ تم مکّار ہو ــــ تم نے مجھے نہایت ذلیل دھوکا دیا۔"

"پرماتما کے لیے ہوش کرو کمار!"

"آئندہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ میں اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔"

"کمار کیا کہہ رہے ہو، یہ دیوانگی اچھی نہیں۔"

"میں اب تمہارے سائے سے بھی بھاگتا ہوں مکّار عورت!"

"کمار، کمار!!"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے ہوئے کمار دروازے ـــ سے باہر نکل گیا ـــ اندرا ایک کرسی میں دھنس گئی۔ اور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

۴

اندرا کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ کہ کمار ایک بیہودہ وہم کے زیر اثر اسے

چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کی باتوں سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ چند دن کے بعد وہ خود بخود اس بیہودہ الزام پر سخت پشیمانی کا اظہار کرے گا۔ اچانک اسے برج کمار کی تحریر ملی۔ جس میں لکھا تھا۔ "میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔"

ان الفاظ کے پڑھتے ہی اس کا دل غم و غصہ میں ڈوب گیا۔ حالات نے اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد کلکتے سے تار آیا کہ برج کمار موٹر کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ اس روح فرسا و جانگداز خبر کے سنتے ہی اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ شدتِ صدمہ نے اس کے حواس پر سخت حملہ کیا۔ چند دن تو وہ مجنونانہ حالت میں رہی۔ آخر امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا زخم بھی مندمل ہونے لگا۔

مندرجہ بالا واقعے کے پورے چار سال بعد اس کی شادی کے لئے بر تلاش کیا جانے لگا۔ والدین کی نظر انتخاب مصور ہریش چندر پر پڑی۔ اور چند دن کے بعد وہ مصور کے پہلو میں پہنچ گئی۔ ہریش چندر کا ذہن ہر وقت ایک تخیلی نسوانی پیکر کی رعنائیوں میں غرق رہتا تھا۔ مگر جب اس نے اندرا کو دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ تمکین چہرے والی عورت اس کے خوابوں کی ملکہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اور بعض اوقات تو اس کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا کہ شاید یہی وہ عورت ہے، جس کی عالم تخیل میں وہ پرستش کرتا رہا ہے ــــ جس کی اب تک وہ پرستش کئے جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور بے اختیارانہ رومال کو چوم لیتا۔

آج اندرا کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس کی شادی کو پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ عزیز و اقارب کی طرف سے اسے تحفے وصول ہو رہے تھے۔ ہریش چندر اسے اپنی عزیز ترین چیز دینا

چاہتا تھا۔ وہ چیز کیا ہو سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے آخر اس کی آنکھیں امید کی روشنی سے چمک اٹھیں۔

اندرا کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی، ہریش کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کروٹیں لینے لگی۔

"تم حیران ہوگی۔ کہ میں نے تمہیں اب تک سالگرہ کے موقعے پر کیوں تحفہ نہیں دیا؟"

"شاید"

"بات یہ ہے اندرا! میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں اپنی عزیز ترین چیز دوں"

"تو وہ عزیز ترین چیز کب ملے گی؟"

"جب تم چاہو"

"سالگرہ کا دن تو آج ہے۔"

"بہتر، آج ہی لے لو۔" ہریش چندر نے مسکرا کر کہا۔

اُس نے اپنی جیب سے ایک ریشمی رومال نکالا اور اندرا کے سامنے رکھ دیا۔ "اندرا یہ میری عزیز ترین چیز ہے۔ اگرچہ یہ ایک رومال ہے۔ مگر اس کی قدر و قیمت صرف میں ہی جان سکتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ!" اندرا کے لبوں سے نکلا۔ اس نے رومال ہاتھ میں لیا۔ اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک نہایت اونچی جگہ سے نیچے گر پڑی ہے۔ ہریش چندر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "چار سال ہوئے یہ رومال مجھے کمپنی باغ میں ملا تھا اور اسے حاصل کر کے مجھے اتنی مسرت ہوئی تھی، جتنی آج تک کبھی نہیں ہوئی۔ اندرا! میں نہیں جانتا اس پیارے رومال کا مالک یا مالکہ کون ہے؟ مگر میں اسے ایک ایسی

عورت سے منسوب کرتا ہوں، جو میرے خوابوں کی ملکہ ہے۔ تم آئیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے خوابوں کی ملکہ اور تم میں بہت مشابہت ہے ---- اب اندرا! تمھیں میرے لئے سب کچھ ہو۔"

وُہ یہ الفاظ سنتی جا رہی تھی اور رومال کے ایک کونے کو جہاں 'ب۔ک' کے حروف کاڑھے ہوئے تھے، دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ اِس وقت بے حس، خاموش اور افسردگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تم سمجھ سکتی ہو اندرا! اس سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔"

اندرا نے رومال ایک طرف رکھ دیا۔ اور اپنے پہلو میں پڑے ہوئے پھولوں کے گلدستے کو دیکھنے لگی۔ ہرلش چندر باہر چلا گیا۔ "وُہی رومال ---- میری مصیبتوں کا منبع"۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ گزشتہ واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ یہی رومال سالگرہ کے موقعے پر اس کے محبوب نے اسے دیا تھا۔ پھر ---- یہی منحوس رُومال اس کا خاوند سالگرہ کے دن اسے دے رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے رومال دیکھ رہی تھی اور سینے کے زخم سے جس پر فراموشی کا پردہ پڑ چکا تھا۔ خون بہ رہا تھا۔ وفورِ صدمہ نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ شام کو جب ہرلش چندر گھر آیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ اندرا بیمار ہے وُہ اس کی تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔

دو دِن بعد صبح کے وقت ہرلش چندر اسکے کمرے میں گیا اس نے دیکھا کہ اندرا بے حس و حرکت پڑی ہے۔ ریشمی رومال اسکے سینے پر پڑا ہے اس نے جسم کو ہاتھ لگایا۔ افسوس وُہ دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو چکی تھی ---- کسی کو بھی اسکی اچانک مَوت کی وجہ معلوم نہ تھی آہ کسے خبر تھی۔ کہ سالگرہ کا تحفہ اس کے لئے "مَوت کا تحفہ" ثابت ہُوا تھا۔

ماہ نومبر ۱۹۳۹ء

(۱)

بھولا بھالا منوہر اگر رمیش بابو کی تمام تمناؤں کا مرکز تھا تو کملا اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ اور اس کی وجہ ظاہر تھی۔ کامل تیرہ سال تک رات دن کی مسلسل التجاؤں کے بعد انہیں پرماتما کی کرپا سے بیٹے کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اسلئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ دونوں اپنے ننھے بچے کو زندگی کا حقیقی سرمایہ نہ سمجھتے۔

وہ دونوں منوہر کے متعلق طرح طرح کی سکیمیں بناتے رہتے۔ رمیش بابو کہتا "جب منوہر پانچ سال کا ہو جائے گا۔ تو میں اسے سکول میں داخل کر دونگا۔ وہیں بورڈنگ

میں رہے گا۔ بورڈنگ میں رہنے سے بچے کے اخلاق کی خاص نگہداشت کی جاتی ہے۔ گھر میں تربیت ناقص ہوتی ہے۔"

اس پر منوہر کی ماں کہتی۔" میں تو اپنے بچے کو بورڈنگ نہیں بھیجوں گی۔ ایک ماسٹر گھر پر آکر پڑھا جایا کرے گا۔"

" اب ہمیں یہ مکان بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ دیکھتی ہو کتنا گرد و غبار اُڑتا رہتا ہے۔ بچے کی صحت پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔"

" میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں، بابو کرشن کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھی خالی ہے۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں صرف پچاس روپے۔"

" پچاس؟ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

" ہوں" کملا بچے کی پیشانی چوم کر کہتی۔" میرے منوہر پہ لاکھوں روپے قربان پچاس روپے کی کیا حقیقت ہے؟"

غرض وُہ اس قسم کی خیال آرائیاں کرتے رہتے۔

جب منوہر پانچ سال کا ہوگیا۔ تو رمیش بابو اس کی تعلیم کے متعلق انتظام کرنے لگے لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی بندوبست ہو، منوہر کو ہلکا سا بخار ہوگیا۔ خیال تھا دو تین دن کے بعد یہ معمولی سی حرارت دور ہو جائے گی لیکن آٹھ دن گزر گئے اور اس دوران میں بخار نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ والدین مضطرب ہوگئے اور بچے کے علاج معالجے میں انتہائی کوشش کرنے لگے۔ کملا بار بار ڈاکٹر کو بلاتی اور جب وُہ آتا تو اس سے بچے کی بیماری کے متعلق کئی سوال ایک ہی سانس میں پوچھ لیتی۔ ڈاکٹر تسلی دیتا۔ بیماری کو ایک معمولی سی حرارت بتاتا۔ مگر بے قرار ماں دیکھ رہی تھی کہ اس کا لختِ جگر روز بروز کمزور و نحیف ہوتا جا رہا ہے۔

ایک تاریک رات کو، جبکہ فضا میں کثیف بادل چھا رہے تھے، کملا منوہر کو رضائی میں لپیٹے، پلنگ پر دیوار سے سہارا لگائے بیٹھی تھی، سامنے کرسی پر رمیش بابو کوئی خط پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا۔ بچے نے ڈر کر آنکھیں کھول دیں۔ اور بھینچی بھینچی آواز میں رونے لگا۔ کملا نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ پھر چمچے کے ساتھ دوائی اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ بچہ برابر روتا جا رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ دوائی اس کے منہ سے نکل کر اس کی ٹھوڑی اور گردن پر بہنے لگی۔ کملا گھبرا گئی اور مضطربانہ لہجہ میں بولی

"منوہر کے پتا! ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

رمیش نے خط کرسی پر رکھ دیا اور پلنگ کے قریب پہنچکر بچے کو دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر کو بلا لاؤ، جلدی کرو، حالت بہت خراب ہے۔"

"باہر بارش ہو رہی ہے" رمیش بابو نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ بچے کی حالت دیکھتے نہیں، رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔"

"خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ بچہ ٹھیک ہے، ادھر لاؤ۔ میں —"

"نہیں۔ اسے رہنے دو۔ نہیں، تم ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔" کملا نے مُصر ہو کر کہا۔

"صبح سہی، اب تو رات کا وقت ہے اور پھر بارش۔ ایسے میں ڈاکٹر کیوں آنے لگا اسے کیا مصیبت پڑی ہے۔"

"تو میں جاتی ہوں، تمہیں تو اپنے بچے کی جان عزیز نہیں۔ مگر مجھے تو عزیز ہے۔"

یہ کہکر کملا بچے کو بستر پر لٹانے لگی۔ یہ دیکھ کر رمیش بابو بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کملا نے بچے کو پھر گود میں اٹھا لیا۔ اور ہولے ہولے اس کے سنہری بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ —— اسکی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔

بچے کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اَور گہرے ہو گئے تھے اَور وُہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ کملا نے مضطرب ہو کر دوبارہ بچے کے منہ میں دوائی ڈالی۔ مگر پہلے کی طرح یہ بھی حلق سے نیچے نہ اُتری۔ کملا نے نوکر کو آواز دی۔

رمیش بابو دَوڑ کر اندر آیا۔ کملا نے اسے دیکھتے ہی بلند آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر آ گیا؟"

"میں کہاں گیا تھا؟" رمیش نے کہا اَور بچے کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

"ڈاکٹر نہیں آیا — تم ڈاکٹر نہیں لائے — میرا بچہ"

"ٹھہرو تو!" رمیش بابو نے کہا اَور بچے کا سوکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"منگو! ڈاکٹر کو لاؤ — جلدی کرو!"

منگو اپنی مالکہ کا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا۔

بچے نے ایک لمبا سانس لیا — اَور اس کے بعد ماں کی آغوش میں منوہر کی نعش پڑی تھی۔

(۲)

منوہر کے فوت ہوتے ہی رمیش بابو اَور کملا کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ان کی زندگی کا تمام سرمایہ لٹ چکا ہے۔ ان کی دنیا بھیانک تاریکیوں میں ڈوب گئی ہے۔ اور ان کی مسرتیں ہمیشہ کے لئے خاکِ نامرادی میں دفن ہو چکی ہیں۔ کئی دن تک وہ دونوں بے حس و حرکت، چپ چاپ، افسردہ و پژمردہ کمرے میں پڑے رہے۔ گویا زندگی اور کائنات سے بیزار ہو چکے ہیں۔

مرد کو عورت کے مقابلے میں دِل بہلانے کے لئے زیادہ ذرائع حاصل ہیں۔

وہ گھر سے باہر جا کر اپنے دوستوں کی محفل میں اپنا غم غلط کر سکتا ہے۔ مختلف تفریحات میں حصّہ لے کر اپنی توجہ زندگی کے غمگین واقعات سے ہٹا سکتا ہے۔ مگر عورت ــــ آہ بد نصیب عورت ان تفریحی وسائل سے یکسر محروم ہے، وہ گھر کی چار دیواری میں مقیّد، غم و حسرت میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ رمیش بابو عزیزوں اور دوستوں کے بار بار کہنے سے بہت حد تک سنبھل گیا، اور آہستہ آہستہ اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے لگا۔ ـ مگر بدقسمت کملا کی متالم حالت میں ذرّہ بھر کمی واقع نہ ہوئی اس کے سینے کا زخم گہرا سے گہرا ہوتا گیا۔ وُہ ہر لمحہ، ہر گھڑی بچے کے خیالات میں ڈوبی رہتی کبھی تو وُہ اس کے کپڑوں کو سینے سے لگا کر اس طرح چیخنے لگتی کہ رمیش بابو اور گھر کے دوسرے لوگ گھبرا جاتے۔ کبھی وہ منو ہر کی ٹوٹی سی چار پائی پر ہاتھ پھیر پھیر کر مادرانہ شفقت سے معمور لہجے میں کہتی ـــ " منو! دیکھو تو صبح ہو گئی اور تو ابھی سو رہا ہے۔ اُٹھو بھگوان کو یاد کرو، سیر کرنے جاؤ ــــ اٹھو بیٹا! صبح دیر تک سوئے رہنا ٹھیک نہیں" ـــ اور کبھی وُہ اپنی ہمسائی کے بیٹے اوپندر ناتھ کو پیار کر کے کہتی ــــ " تُو تو سکول سے آ گیا۔ مگر میرا منو ہر ابھی وہیں ہے، اچھے دوست ہو اس کے۔ آئندہ اسے ساتھ لایا کرو۔ یہی تو اچھے ہمجولیوں کا کام ہے۔

رمیش بابو نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی بیوی کا جنون لو از غم دور ہو جائے مگر بے سود کملا کا وہم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل پاگل ہو گئی۔ یہ دیکھ کر رمیش نے مجبوراً بیوی کو اس کے بھائی کے ہاں بھجوا دیا۔

رشتہ دار تو پہلے ہی رمیش کو شادی کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ اور اب تو ان کا اصرار اور بڑھ گیا۔ آخر رمیش نے شادی پر اپنی رضا مندی ظاہر کر دی ـــ ایک معزز گھرانے میں بات چیت ہوئی اور دو تین ماہ کے بعد دوسری بحیثیت بیوی کے رمیش کے گھر میں آ گئی۔

دیوانی کملا اپنے بھائی کے گھر چند دن تو مجنونانہ حرکتیں کرتی رہی اور پھر اسکی حالت میں سکون پیدا ہوگیا۔ جب گھر کی عورتیں رمیش بابو کی نئی بیوی کے متعلق گفتگو کرتیں تو وہ بڑے غور سے اُن کی باتیں سنتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ ہر ایک بات کا اندازہ لگا رہی ہے۔

ایک دن اُس نے سنا۔ کہ رمیش بابو کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور جب شام کے وقت اس کا بھائی دکان بند کرکے گھر آیا تو وہ اس سے کہنے لگی :-

"میں وہاں جاؤنگی ـــ اُن کے گھر"

"اُن کے گھر ـــ لیکن لاجونتی تو شملے میں ہے۔ اور وُہی تمہاری سہیلی ہے۔" اُس کے بھائی نے کہا۔

"نہیں وہاں نہیں ـــ میں ان کے گھر جاؤں گی ـــ جن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے تمھیں معلوم نہیں؟" کملا نے مسکرا کر کہا۔

"رمیش بابو کے گھر؟"

دیوانی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"پگلی کہیں کی ـــ وہاں بیٹھو، کھانا کھا لیا ہے کیا؟" یہ کہہ کر کملا کا بھائی نہانے کے لیئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو بھی دیوانی یہی الفاظ دہراتی رہی۔ اور دُوسرے دن تو وہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

رمیش بابو کو اس کی خبر مل گئی۔ وُہ آیا اور کملا کے بھائی کو سمجھا بجھا کر کملا کو اپنے

ساتھ لے گیا۔

کملا نے جب ننھے سے مسکراتے ہوئے گول مول بچے کو دیکھا۔ تو وہ اس طرح خوش ہوئی جس طرح ایک لڑکی نئی خوبصورت گڑیا کو لے کر خوش ہوتی ہے۔ اس کا دل بہل گیا۔ وہ ہر وقت بچے کو گود میں لئے پھرتی۔ اسے کھلاتی اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ہنساتی۔ نرائن بھی کملا سے مانوس ہو گیا ـــ اتنا مانوس ہو گیا کہ کملا کے مقابلے میں اپنی ماں کی بھی کم پروا کرنے لگا۔

کئی سال گزر گئے۔ اچانک نرائن بیمار ہو گیا۔ معمولی سا بخار تھا مگر بچے کو کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی۔ جو چیز کھاتا قے کے ذریعے نکال دیتا۔

ایک رات وسنتی بیمار بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کے قریب کملا بیٹھی متفکرانہ نگاہوں سے نرائن کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور ان سے کچھ دور رمیش بابو لیٹا تھا۔

وسنتی نے بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بدن سخت گرم ہے، جلتا ہوا کوئلہ معلوم ہوتا ہے۔ صبح سویرے ڈاکٹر کے یہاں لے جانا۔"

"بہت گرم ہے بدن" ـــ رمیش نے کہا۔ رات خیر سے گزرے صبح ڈاکٹر کو یہیں لے آؤں گا۔"

کئی منٹ گزر گئے۔ یکایک وسنتی نے سامنے کی کرسی کو خالی دیکھ کر کہا ـــ "کملا کہاں گئی۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی۔"

"دوسرے کمرے میں ہو گی ـــ نرملا وہیں ہے۔ اور ہاں صبح جو دوائی ڈاکٹر سے لایا تھا وہ بچے کو پلائی؟"

"او ہو! اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ وہ الماری میں پڑی ہے۔ نیلی بوتل....."

رمیش نے اُٹھ کر دوائی نکالی اَور بچے کو پلانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بچے نے آنکھیں بند کر لیں اَور سو گیا۔

رمیش بھی اطمینان کے ساتھ لیٹ گیا۔ دو پونے دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ لگی۔ اور ابھی وہ پوری طرح سو یا بھی نہ تھا کہ اسے ایک بلند آواز سنائی دی۔

" بابوجی! "

رمیش بابو جلدی سے اُٹھا۔ اس کے پاس منگو نوکر کھڑا تھا۔

" وُہ — ہیرا اُسے لایا ہے — زخمی — "

" ہیرا لایا ہے، کیسے ؟ "

" باہر آ کر دیکھئے۔ "

رمیش بابو نے جلدی سے سلیپر پہنے اَور دروازے کے پاس آیا۔ دروازے کے پاس ایک ٹانگہ کھڑا تھا۔ رمیش بعجلت وہاں پہنچا۔ ٹانگے میں کملا زخمی پڑی تھی اَور رمیش کے ہمسائے ہیرا لال نے اسے تھام رکھا تھا۔

" کیا ہوا یہ ؟ " رمیش نے گھبرا کر پوچھا۔

" ہونا کیا تھا۔ آپ نے اس کا خیال نہیں کیا۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ یہ دیوانی ہے پھر بھی گھر سے باہر نکلنے دیا۔ اگر میں اتفاقاً وہاں سے نہ گزرتا تو اسے یہاں کون لاتا " ہیرا لال نے کہا۔

" بات کیا ہے بتاؤ تو ؟ " رمیش نے پوچھا — " کملا ڈاکٹر گوپال کے مکان کے پاس ٹانگے کے نیچے آ گئی " ہیرا لال نے کہا۔ رمیش نے جھک کر کملا کے چہرے کو دیکھا۔ کملا کے چہرے پر ایک دم سرخی سی آ گئی اَور وُہ رمیش بابو کو اضطراب انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی " نرائن — بچہ — ڈاکٹر " کملا نے یہ الفاظ دو بارہ کہے اَور پھر اس کا جسم ہمیشہ کے لئے بےحِس و حرکت ہو گیا۔

اگست ۱۹۳۹ء

شاہی دربار کی حسین ترین رقاصہ اپنے آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہوئی اور ایک لفظ کہے بغیر کنیزوں کی مدد سے، اپنی پیر کا مخصوص لباس اتارنے لگی۔ اور چند منٹ بعد اس کام سے فراغت پا کر مخملیں کرسی میں دھنس گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مغموم و ملول نظر آ رہی تھی ـــــ دونوں کنیزیں ایک گوشے میں کھڑی حیرت سے ایک دوسری کو دیکھ رہی تھیں

" تم چلی جاؤ، اور جب تک میں نہ بلاؤں کمرے میں آنا ـــــ کوئی اور بھی کمرے میں نہ آئے۔ " رقاصہ نے جھنجھلا کر کہا۔ کنیزیں مبہوت و ششدر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد رقاصہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر سر رکھ کر اپنے خیالات میں کھو گئی۔ دو تین منٹ کے بعد سر اُٹھایا، سامنے دیکھا اور اُس کی نگاہیں سنگِ مرمر کی میز پر رکھے ہوئے ایک سفید مجسمہ پر جم گئیں۔ یہ ایک نہایت حسین و جمیل مجسمہ تھا۔ جس کے ساتھ، ایک بھیانک سیاہ سانپ لپٹا ہوا تھا۔ رقاصہ ٹکٹکی باندھ کر اس مجسمے کو دیکھنے لگی اور خیالات کا وُہ ہجوم جو کئی دن سے اس کے ذہن میں منڈلا رہا تھا اب سمندر کی طوفانی موجیں بن بن کر اسکے دل و دماغ میں بے قرار ہو گیا۔ وُہ مضطرب ہو کر کرسی سے اُٹھ بیٹھی۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

وہ دربار کی سب سے بڑی رقاصہ تھی۔ اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل تھی، ہر قسم کی آسائش میسر تھی اس کی نئی پوشاکوں پر، اس کے گلے کے ہاروں پر، اور اس کے خوبصورت زیورات پر ہر ماہ ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ محل اور محل کے باہر اس کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ لوگ اسکی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ بادشاہ اس پر خاص مہربان تھا۔ مگر ان تمام چیزوں کے باوجود چند دن سے اس کی روح میں ایک خلش سی، اس کے دماغ میں ایک اضطراب سا اور اس کے دل میں ایک بیقراری سی موجزن تھی۔

"مَیں محل میں محکوم ہوں ——— ایک خادمہ کی سی زندگی بسر کر رہی ہوں" وُہ بار بار سوچتی اور ہر بار اُسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔

پرسوں وُہ سیر کرتے کرتے دور نکل گئی۔ ایک جگہ جلاہے کپڑے بُن رہے تھے وُہ وہاں ٹھہر گئی۔ مزدوروں میں سے ہر مرد، ہر عورت، نہایت مسرور، نہایت خنداں نظر آ رہی تھی۔ تمام کے تمام لوگ خوشی کے گیت گا رہے تھے۔ گیت گا گا کر اپنا کام کر رہے تھے۔ کسی کے چہرے سے بھی غم و فکر کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ جانتے ہی نہیں غم و فکر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

وسیع میدان، کھلی ہوا اور پھر آزادی کی نعمت، رقاصہ نے آہ بھری اور ایک مزدور عورت سے باتیں کرنے لگی۔

اس عورت نے اُسے پہچان لیا اور بڑے ادب کے ساتھ اس سے گفتگو کرنے لگی۔ آناً فاناً دوسرے مزدوروں کو بھی رقاصہ کی حیثیت کا علم ہو گیا۔ تمام کے تمام اپنا کام کاج، چھوڑ کر اس کے گرد کھڑے اسے اس انداز سے دیکھنے لگے۔ گویا وُہ کوئی عجیب انسان ہے اور اس قسم کا عجیب و غریب انسان وُہ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔

رقاصہ نے سُنا ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی۔ "یہی تو وہ رقاصہ ہے جس کے لئے ہم کپڑا بُنا کرتے ہیں۔ یاد ہے پچھلے مہینہ وہ خوبصورت کپڑا اسی کے لئے بنایا گیا تھا نا۔ بادشاہ اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ یہ اس کے دربار میں ناچتی ہے۔"

"آخر ہے تو نوکرانی ہی نا۔" دوسری بولی۔

آخری فقرہ سُن کر رقاصہ کو اپنے وجود سے شدید نفرت ہو گئی۔ وُہ دربار کی حسین ترین رقاصہ سہی، بادشاہ کی منظورِ نظر سہی، پھر بھی وہ نوکرانی ہے، صرف ایک نوکرانی جس کی کوئی حیثیت نہیں، جس کی کوئی وقعت نہیں اور جس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ بادشاہ کے احکام کی تعمیل کرے۔ بادشاہ کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

رقاصہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے خادم گاڑی لے آئے۔

"بادشاہ سلامت آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ایک خادم نے کہا۔

واقعی بادشاہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ اس دن رقاصہ کو بادشاہ کے سامنے نیا رقص کرنا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مزدور پھر مٹتے گیت گاتے اپنا کام کرنے لگے۔

آج بھی رقاصہ مزدوروں کے پاس کئی منٹ تک کھڑی رہ کر ان کے ساتھ اپنا موازنہ

کرتی رہی تھی۔ اس کے خیال میں مزدور اس سے زیادہ خوش نصیب تھے۔ کیونکہ انہیں آزادی حاصل تھی اور یہ محکوم تھی، غلام تھی، تمام راہ وہ اسی خیال میں ڈوبی رہی۔ وہ آرزومند تھی کہ آزادی کے ساتھ پھرے، آزادی کے ساتھ گفتگو کرے ـــــ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ مگر بادشاہ کے عیش و عشرت نے اُس کا وجود، اس کی ہستی، اس کا دل و دماغ، الغرض اس کا سب کچھ خرید لیا تھا۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ بادشاہ کے لئے وقف ہو چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر صرف ایک مقصد تھا، اور وہ تھا بادشاہ کی خوشنودی کا حصول، آقا جب چاہے اس کے وجود کو، ایک رنگین کھلونا سمجھ کر اپنا دل بہلائے۔ اس کے رقص سے لطف حاصل کرے۔ اُسکی شیریں آواز سے اپنے کانوں کو راحت پہنچائے ـــــ رقاصہ پھر کرسی میں دھنس گئی۔

سورج کی شعاعیں بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے داخل ہو ہو کر اس کے سنہری جسم پر پڑ رہی تھیں۔ کمرے میں حبس سا پیدا ہو گیا تھا۔ مگر رقاصہ اِس وقت ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے خیالات میں غرق تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک نیا واقعہ پھر رہا تھا۔

آج سے کئی ماہ قبل ایک نزہت آگیں صبح کو وہ بادشاہ کے سامنے اپنا استادانہ رقص کر رہی تھی اور بادشاہ خاص طور پر اس کے رقص سے محظوظ ہو رہا تھا، اتنے میں چند سپاہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک وجیہہ نوجوان کو بادشاہ کی بارگاہ میں لے آئے۔ ایک سپاہی نے بیان کیا "حضور، یہ شوخ گستاخ اور بے ادب ہے۔ حضور کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا۔"

"ہمارے احکام کی تعمیل نہیں کرتا؟" بادشاہ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں حضور! آپ نے حکم دیا تھا۔ کہ نئے محل کو جلد سے جلد مکمل کیا جائے۔ اسی کے لئے ہم نے ہزاروں آدمی اس کام پر لگا دیئے۔ ہم نے اس شخص سے بھی کہا۔ کہ محل کی تعمیر میں ہماری مدد کر۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ حضور! یہ باغی ہے، نافرمان ہے۔"

بادشاہ کی آنکھیں غصہ سے سُرخ ہوگئیں۔

"سچ ہے یہ؟"

"بالکل سچ۔"

"اتنی جُرأت؟"

"آپ اسے جو چاہیں سمجھ لیں، مگر میں سمجھتا ہوں۔ کہ ایک ظالمانہ حکم کی پابندی مجھ پر لازم نہیں۔"

"ظالمانہ حکم؟" بادشاہ کی آواز غضبناک ہوگئی۔

"رعیت کے فاقہ کش اور بے کس افراد کو اپنا حقیر ترین غلام سمجھنا کہاں کا انصاف ہے۔۔۔؟"

"ملعون، بے شرم!"

میں ملعون اور بے شرم سہی، مگر میں ظلم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں ایک بے غیرت غلام نہیں"

"ذلیل انسان۔۔۔!"

میں ذلیل انسان نہیں، ذلیل انسان وہ ہے۔ جو تمہاری ذرا سی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنا دل، اپنا دماغ تمہارے قدموں پر ڈال دیتا ہے، میں اپنے دل و دماغ کا مالک ہوں، دنیا کی کوئی طاقت بھی میرے ارادوں پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی کوئی ہستی بھی مجھ سے میری آزادی نہیں چھین سکتی"

"پاجی تمہارے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔"

"آزادی کی ایک گھڑی غلامی کے ہزار سالوں سے بہتر ہے۔ نوجوان نے دلیری سے جواب دیا۔

"لے جاؤ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔" تاج و تخت کے مالک نے گرج کر کہا۔

نوجوان کے چہرے پر خوف کا ہلکا سا اثر بھی نہیں تھا۔ وہ جس بے باکی سے آیا تھا۔ اسی بے باکی سے جانے لگا۔

رات کو جب رقاصہ بستر پر لیٹی تو یہ واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اور وہ اس پر غور کرنے لگی۔ نوجوان کی بیباکی، جرأت اور دلیری نے اس پر بہت اثر کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ سمجھتی تھی۔ کہ نوجوان نے جو کچھ کیا ہے۔ جذبات کے زیر اثر کیا ہے۔ بادشاہ رعیت کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے رعیت کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ مگر آج بار بار غور کرنے کے بعد اس کا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں اس دلیر نوجوان کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی تھی، اس نے سمجھ لیا تھا کہ نوجوان نے جو کچھ کیا ہے، بالکل درست اور بجا ہے۔ آخر بادشاہ کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے عیش و عشرت کے لئے غریب رعایا پر ظلم کرے؛ وہ کیوں دوسروں کو آزادی کی نعمت سے محروم کرے۔ لوگ کس لئے اس کی پرستش کریں، رعیت کا ہر فرد اسی کی طرح انسان ہے۔ پھر ایک انسان دوسرے انسان کو کیوں پوجے؟

وہ بیقرار ہو کر کرسی سے اٹھ بیٹھی، اور اپنی زندگی پر غور کرنے لگی۔

"کیا میری زندگی بادشاہ کی خوشنوا بلبل کے مانند ہے؟" اس نے سوچا۔ "بادشاہ نے خوبصورت اور خوش نوا بلبل کو سنہرے پنجرے میں بند کر رکھا ہے۔ اس پنجرے میں نہایت خوب صورت اور زریں برتن رکھے ہوئے ہیں۔ پنجرہ ایک بلند جگہ پر لٹکایا گیا ہے۔ مگر کیا یہ بلبل اسیر اتنی قدر و منزلت پر اتنے آرام و آسایش پر، اتنی تزئین و آرائش پر خوش ہے، کیا وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ بادشاہ کا منظور نظر سہی، مگر ہے تو اسیر، اسے طرح کا آرام میسر سہی، مگر ہے تو آزادی سے محروم، پنجرہ لوہے کا ہو یا سونے کا۔ تیلیوں کا ہو

یا کسی اَور چیز کا، بہرحال پنجرہ ہے۔ قید خانہ ہے۔ اَور اس ظالم پنجرے میں، اس ہولناک قید خانہ میں کوئی پرندہ بھی خوش نہیں رہ سکتا۔

یہ بدنصیب پرندہ جب فضا میں دوسرے پرندوں کو خوشی سے اُڑتے ہوئے، خوشی سے گیت گاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا دل کس قدر چاہتا ہے۔ کہ وہ بھی ہوا ہی میں اُڑے، دور تک اُڑتا چلا جائے، گائے اَور آزادی کے ساتھ گائے، مگر آہ وہ سنہری سلاخوں میں گرفتار انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ چمکتی ہوئی سلاخیں آگ کے شعلے ہیں یہ سونے کے برتن آگ کے انگارے ہیں اَور یہ مخملیں گدی کانٹوں کا بستر ہے۔

وُہ بھی محل میں لپٹی ہوتی ہے۔ زیورات سے لدی ہوتی ہے۔ مگر بلبلِ اسیر کے مانند ہر لحظہ ہر گھڑی قید ہے۔ بادشاہ اسے خوبصورت زریں لباس سلوا کر دیتا ہے۔ تاکہ اس کے حسن میں اضافہ ہو اَور وہ اس کے وجود سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کر سکے۔ وہ اس کیلئے دُور دُور سے ماہرینِ فن بلاتا ہے۔ تاکہ اس کے رقص میں اَور کمال پیدا ہو اور یہ کمالِ رقص اس کے لئے خاص تفریح کا سامان بن سکے۔ بادشاہ کے پیشِ نظر صرف ذاتی اغراض ہیں رقاصہ کے تمام جذبات، تمام احساسات غلام ہیں۔ اس سے زیادہ اَور کیا غلامی ہو سکتی ہے؟ اس سے بڑھ کر آزادی سے کیا محرومی ہو سکتی ہے؟

یکایک اس کی نگاہ کمرے کے ایک حصے میں بکھرے ہوئے چمکتے ہوئے لباس پر پڑی اس لباس پر درزیوں کے کئی مہینے صرف ہو گئے تھے۔ یہ لباس خاص طور پر رقاصہ کے لئے بنوایا گیا تھا تاکہ وہ جشنِ شاہی کے دن یہ لباس پہن کر بادشاہ کے سامنے رقص کرے۔

رقاصہ نے محسوس کیا کہ لباس میں نشتر لگے ہوئے ہیں۔ اس نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ کیا وہ ہمیشہ غلامی کی زندگی بسر کرتی رہے گی؟ کیا وہ اسی طرح بادشاہ کے لئے ذریعۂ عشرت بنی رہیگی؟

اس نے مضطربانہ کھڑکی کھول دی، ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کمرے میں رقص کرنے لگے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ننھے ننھے بچے اچھلتے کودتے چلے جا رہے تھے۔ غریب لوگ آزادی کے گیت گا رہے تھے۔ پرندے آزادانہ ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ محل کے باہر ہر چیز آزاد تھی۔

یکایک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر خادمہ کو آواز دی۔ وہ دوڑی ہوئی آئی۔

"میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ سیر کو جاؤنگی۔ مگر گاڑی میں اکیلی بیٹھوں گی۔"

"تو کیا میں بھی ساتھ نہ چلوں؟" خادمہ نے پوچھا۔ وہ خوش تھی کہ آخر اس کی مخدومہ کا غم و فکر دور ہو گیا ہے۔

"ہاں! تم گاڑی میں بیٹھ سکتی ہو!"

خادمہ چلی گئی۔

خادمہ کے جانے کے بعد رقاصہ نے آخری بار نفرت انگیز نگاہ سے لباس کو دیکھا اور بیقراری کے ساتھ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"گاڑی آ گئی ہے۔" خادمہ نے کہا۔ رقاصہ کی نگاہیں اور چمک اٹھیں اور کمرے سے وہ اس طرح نکل گئی — جس طرح ایک پرندہ پنجرے سے آزاد ہو کر اُڑ جائے۔

قیدی کی سرگزشت

اگست ۱۹۳۶ء

بدنصیب قیدی جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چند گھنٹے پیشتر وہ آزاد تھا۔ دنیا کی تمام راحتیں اسے حاصل تھیں۔ اس کا ہر مقصد تکمیل کی مسرت سے ہمکنار تھا۔ اور ہر ایک آرزو کامیابی کی نشاط انگیزیوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، زندگی کے روشن و مصفا راستے پر رواں دواں۔ یکایک عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اسے منصف کی خوفناک و لرزہ خیز آواز میں "حبس دوام" کی سزا کا حکم سننا۔ کچھ دیر کے لئے تو اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے، اور کیا سن رہا ہے، اسے منصف کی خشمناک اور آتشیں نگاہیں جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح نظر آ رہی تھیں اور اس کی گرجتی ہوئی آواز ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی سے ایک عظیم الہیئت پتھر گرتا ہوا ہول انگیز شور پیدا کر رہا ہے۔ ہتھکڑی کی جھنکار گونجی، اس کے ہاتھ لوہے کی وزنی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک خواب دیکھ رہا ہے، ایک خوفناک دہشتناک خواب !۔۔۔ کمرۂ عدالت میں وکلاء اور دیگر حاضرین کی ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی آنکھیں، اسے یوں نظر آ رہی تھیں گویا دور اُفق خونیں پر ستارے آپس میں ٹکرانے کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ سپاہیوں کی حراست میں اس نے کمرے سے باہر نکلنے کے لئے قدم اٹھایا، دو تین گھنٹوں کے بعد اسے قید خانے کی آہنی سلاخوں میں پہنچا دیا گیا۔ ہتھکڑی اتار دی گئی۔ دوسرے قیدی تمسخر انگیز نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اور اپنی بھدی آواز میں اسے اشارے کر کر کے کچھ کہنے لگے۔ اس کے کانوں میں تمام آوازیں آتی تھیں مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کی حالت دریا میں ڈوبتے ہوئے ایک ایسے انسان کی طرح تھی۔ جس نے خود کو ہچکیں موجوں کے سپرد کر دیا ہو۔ آخر کار اسے سب سے آخری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ لوہے کی بڑی بڑی موٹی اور اونچی سلاخیں اس کے گرد کھڑی تھیں، اور ایک طرف سلاخوں سے کچھ فاصلے پر سر بفلک پہاڑوں کا سلسلہ جا رہا تھا۔ وہ متحیّر نظروں سے سلاخوں کو دیکھنے لگا۔ ان پر ہاتھ رکھنے لگا۔ اس کی چاروں طرف آہنی سلاخیں تھیں، خوفناک اونچی آہنی سلاخیں، اور بلند پہاڑ ان کے سوا اور کچھ بھی اسے نظر نہ آتا تھا۔

قیدی ایک متمول خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ دولت مند والدین نے اس کی تعلیم و تربیت میں خاص کوشش سے کام لیا تھا۔ اس کا والد ایک بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اور اسے امید تھی کہ اس کا اکلوتا لڑکا بھی اپنی علمی صلاحیتوں کی بنا پر حکومت کی نگاہوں میں خاص امتیاز حاصل کریگا۔ اور شہباز کی محنت پسندی نے بھی کبھی اپنے والد کے ارادوں کو تقویت دینے

میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ یکایک ملک کی دو پارٹیوں میں فساد ہو گیا۔ شہباز ایک پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اور اپنے ساتھیوں کی نظروں میں خاص وقعت حاصل کرنے کے لئے اس نے مخالف پارٹی کے لیڈر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ تھا جرم جس کی پاداش میں اسے تمام عمر کے لئے لوہے کی سلاخوں میں دنیا کی تمام مسرتوں سے محروم کر کے، عزیزوں اور دوستوں سے جدا کر کے لایا گیا۔ اسے اس جرم کی پاداش میں پھانسی ملتی۔ مگر اس کے باپ کی خدمات آڑے آئیں اور پھانسی کی سزا حبس دوام میں تبدیل ہو گئی۔

وہ کوٹھڑی میں گرد آلود، پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ کے بعد اٹھا اپنی پیشانی سلاخوں سے لگا کر باہر پہاڑوں کو دیکھنے لگا۔ آہ! ان پہاڑوں کے پیچھے خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا تھی، وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ یہاں آئے ہوئے اسے پورے سات گھنٹے گزر چکے تھے۔ ان سات گھنٹوں میں اسے کیا کیا محسوس ہوا؟ تپش، پریشانی، خوف، بے چینی، وہ بار بار بھاگنے کا ارادہ کرتا، مگر سلاخیں اس کے سامنے آ جاتیں اور وہ اس خواب پریشاں سے چونک اٹھتا۔ متعدد بار اس نے سلاخوں پر ہاتھ رکھے، اپنے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے، کیوں؟ کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کا سلاخوں، پہاڑوں کے پیچھے لینے والی روشن، رنگین، نشاط انگیز و دلچسپ دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا اور دنیا کے نظاروں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تاہم غیر ارادی طور پر ایسی حرکات اس سے سرزد ہو رہی تھیں۔ انسان بعض اوقات سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ تاریکی کے دیوتا کے لمبے لمبے ناخن بڑھ بڑھ کر، روشنی کی قبا کے پرزے پرزے اڑا رہے تھے۔ ایک ایسے نو گرفتار پرندے کی طرح جو بیتاب ہو ہو کر، قفس کی دیواروں

سے ٹکرا ٹکرا کر، زخمی ہو ہو کر مایوسانہ گر رہا ہو، اسکی آرزوئیں، امیدیں بھی آہنی سلاخوں سے تصادم کر کر کے مایوسیوں کی صورت میں تبدیل ہو رہی تھیں، جیسے جیسے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اس کی پریشانی بھی ترقی پذیر! بار بار وُہ سلاخوں کے پاس جاتا پھر واپس آ جاتا، آخر چٹائی پر لیٹ گیا۔ پھر بیقرارانہ اٹھا۔ اور مضطربانہ چلنے لگا۔ اس کی پیشانی سلاخوں سے ٹکرائی اور وُہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

(۲)

شہباز کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے دائیں بازو کو زور زور سے ہلا رہا تھا۔ وہ لیٹے ہی لیٹے مبہوت وششدر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے پاس ایک بوڑھا شخص تھا۔ جو ہمدردی ـــــ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک تو وہ بالکل نہ سمجھ سکا کہ بات کیا ہے؟ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی پیشانی سے خون نکل نکل کر، اس کی بھوؤں پر، اور اس کے گالوں پر جم گیا تھا۔ جسم کے عضو عضو میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ دماغ میں نشتر چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھیں درد سے بیقرار تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ مگر شدت درد سے بیقرار ہو کر ـــــ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ساتھ کی کوٹھڑیوں میں شور وغل برپا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہ ایک سنسان، لق و دق جنگل میں کھڑا ہے۔ آندھی کے تیز و تند جھونکے درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ شور تھمنے لگا۔ وُہ دو منٹ تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ بوڑھے نے زور سے اس کا بازو کھینچا۔ شہباز نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، ان سے پانی بہنے لگا۔ اب تکلیف کسی حد تک کم ہو گئی تھی، وہ متحیرانہ بوڑھے کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ گزشتہ واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ جج کی خوفناک آواز، ہتھکڑی ـــــ اس نے اپنے اردگرد دیکھا، وہی خوفناک لرزہ خیز سلاخیں کھڑی تھیں۔

"لو یہ کھا لو"۔ بوڑھے نے اس کے پاس پڑی ہوئی، ایک چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے بولنے کے لئے منہ کھولنا چاہا۔ مگر ناکام رہا۔ اس کے دانتوں میں سخت درد محسوس ہونے لگا۔ حلق سوکھا ہوا تھا۔ اس نے زبان تالو پہ پھیری تو کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"تمہارے سر پر زخم آیا ہے۔ رات کو گر پڑے ہو گے اور سر پھٹ گیا ہوگا؟" بوڑھے نے کہنا شروع کیا "میں جمعدار سے جا کر کہتا ہوں۔"

بوڑھا یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہباز دو تین منٹ تک گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ اور سلاخوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی انگلیاں بے اختیار شبنم آلود سلاخوں سے مس کرنے لگیں۔ سامنے سورج پہاڑ کے عقب سے طلوع ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے اس کی پیشانی کو مس کرنے لگے۔ اب اس کے ہوش و حواس کسی حد تک قائم ہو گئے تھے۔ وہ آدھ گھنٹہ تک ایک ہی جگہ پر اپنی پیشانی ٹھنڈی سلاخوں سے لگائے، ہاتھوں کو باہر نکال کر کبھی آنکھیں بند کر کے اور کبھی انہیں کھول کر کھڑا رہا۔ معلوم نہیں وہ کب تک کھڑا رہتا۔ کہ ایک کرخت آواز اس کے کان میں آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جیلخانے کا سیاہ فام وار وغہ اس کے پاس کھڑا، استہزا انگیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بائیں جانب وہی بوڑھا تھا۔

"گر پڑے تھے رات کو؟" جمعدار نے شہباز کو مخاطب کر کے کہا۔

"سرکار! رات کو اندھیرے میں گر پڑا ہوگا۔" بوڑھے نے کہا۔

شہباز نے پہلی بار اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہاں اسے کوئی کھردری سی چیز محسوس

ہوئی۔ وہ خاموش رہا۔

"دیکھو ناجو!" جمعدار نے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ جب یہ چاول کھالے تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

"تمہاری زبان سے کوئی حرف نہیں نکلتا بھائی! تم نے تمام عمر یہاں رہنا ہے۔" بوڑھے ناجو نے جمعدار کے جانے کے بعد کہا۔ ناجو کے یہ الفاظ پتھر بن کر اس کے دماغ پر گرے۔ "تمام عمر یہاں رہنا ہے"۔ اس قید خانے میں، لوہے کی سلاخوں میں تمام عمر، اس کے دماغ میں خیال پیدا ہوا۔ ایک بار پھر گزشتہ واقعات کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔

"ہیں" اُس نے بمشکل کہا۔

"تو تو کیا چاہتے ہو؟"

شہباز نے اپنا سر سلاخ کے ساتھ لگا دیا۔

ناجو نے وہی چیز، جو وہ پہلے لایا تھا، اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ ایک مٹی کی تھالی تھی جس میں چاول تھے اور ان کے اوپر کراہت انگیز دال۔ اس نے پہلی بار چاول کی تھالی کو دیکھا اور پھر مستفسرانہ بوڑھے کو دیکھنے لگا۔

"کھاتے کیوں نہیں ہو بھائی!" ناجو نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب نہیں کھانا چاہتے ہو تو چلو میرے ساتھ، مرہم پٹی کرا کر کھا لینا۔" یہ کہہ کر اس نے شہباز کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد شہباز پھر اپنی کوٹھڑی میں تھا۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی، وہ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ تھالی کو اٹھایا اور لقمہ منہ میں ڈالا۔ کچھ حصہ کھانے کے بعد اس نے تھالی کو زمین پر رکھ دیا۔ اس کے دانتوں میں سخت درد ہو رہا تھا۔ پانی کے چند گھونٹ پیئے۔ آج کا دن زندگی کے گزشتہ واقعات کے تصورات میں گزر گیا۔ رات آئی

بہت بے چینی سے کاٹی۔ صبح کے وقت اس کے سامنے چاول کی تھالی رکھی تھی۔ اب کے اس نے تمام چاول کھالئے۔ اور گزشتہ واقعاتِ زندگی اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے، مگر آج ایک واقعے کا اضافہ تھا۔ اور وُہ ایک خوبصورت لڑکی سے عشق تھا۔ یہ لڑکی کون تھی؟ قمری گیسو دراز، آہو چشم قمری۔ قمری اس کا حقیقی نام نہیں تھا، مگر شہباز اسے پیار سے قمری کہتا تھا۔ قمری سے اس کی ملاقاتیں ــــ کئی بار ہوئیں۔ عہد و پیمان ہوئے، مگر بدقسمتی سے یہ حسین دوشیزہ تپِ دق میں مبتلا ہو کر فوت ہوگئی۔ اسے سخت صدمہ پہنچا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کا زخم مندمل ہوگیا۔ اور چار پانچ سال کے بعد اس واقعے کو قریباً قریباً وُہ بھول گیا۔ آج اس آہنیں سلاخوں والے کمرے میں اس کی یادِ زمانۂ محبت کے خوشگوار لمحات کی نشاط زائیوں کے آغوش میں کروٹیں لینے لگی۔

شام کی ظلمت پھیل رہی تھی۔ ناجو کھانا لیکر آیا۔ وُہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

(۴)

شہباز کو یہاں آئے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ وہ خوفناک آہنیں سلاخوں میں ایک سو اسّی دن اور ایک سو اسّی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ رات دن گم سم، خاموش، افسردہ پڑا رہتا۔ اس کا دل کوئی کام کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر بحیثیت ایک قیدی ہونے کے وُہ مشقت کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے ذمے کتابوں کی نقل تھی۔ صبح جب آفتاب کی شعاع اولیں سامنے کے پہاڑ کی چوٹی کو چومتی۔ وُہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ جمعدار۔ اور قید خانے کے دیگر منتظم اس سے خوش تھے۔ کتابوں کے نقل کرنے میں اس کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ لیکن چند دن سے وُہ اس میں ایک قسم کی لذت محسوس کر رہا تھا۔ اور اس میں ایک اور لذت بھی شامل ہوگئی تھی۔ اور وُہ بوڑھے ناجو کا انتظار تھا۔ وُہ

پہروں دروازے کی جانب دیکھتا رہتا۔ اور جب ناجو آتا۔ تو اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی، اور اس کے جانے کے بعد ایک قسم کی خلش شہباز کے دل پر طاری ہو جاتی وہ خود نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ ناجو کے لئے اتنا بیقرار کیوں ہے، ناجو مسکرا کر اسے کہتا "مجھے یہاں کام کرتے ہوئے ۲۵ سال ہو گئے ہیں۔ لیکن تمہارے ایسا انوکھا قیدی میں نے آجتک نہیں دیکھا تھا۔

شہباز اس کے جواب میں مسکرا دیتا۔

شہباز اسے اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات مزے لے لے کر بتاتا۔ اور وہ اسے اپنے حالات۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ وہ عمر کے ساڑھے چار سال یہاں بسر کر چکا تھا ساڑھے چار سال کا لمبا عرصہ، قید خانے کی آہنی سلاخوں میں، آج بھی وہ حسب معمول 'ناجو' کا انتظار کر رہا تھا۔ دروازے پر قفل کھلنے کی آواز آئی، ناجو آیا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا بھی آیا جس نے ہاتھوں میں بلی کا بچہ پکڑا ہوا تھا۔

"یہ میرا پوتا ہے"۔ ناجو نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں سے بدل دیا گیا ہوں"۔

شہباز کے چہرے پر مایوسی برسنے لگی۔

"تم نہیں آیا کرو گے ناجو؟"

"نہیں کوئی اور شخص آیا کریگا۔"

"مگر تمہیں آنا چاہیئے ناجو"

"یہ قید خانہ ہے بھائی، یہاں ہماری یا تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔" ناجو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

شہباز اُٹھ بیٹھا۔ اِس نے لڑکے کو دیکھا۔ پھر معاً اس کی نظر بلی کے بچے پر جا پڑی۔
"لڑکے! یہ مجھے دو۔" شہباز نے بچے کو لینے کے واسطے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ میری مانو کا بچہ ہے۔" لڑکے نے معصومانہ انداز میں کہا۔
"یہ مجھے دیدو نا!"
"نہیں میری مانو روئے گی، ہے نا دادا؟" اس نے بوڑھے ناجو کی طرف دیکھ کر کہا۔
"دیدو ستّو! تم اس بچے کو کیا کرو گے۔ بلی جو تمہارے پاس ہے۔" ناجو نے کہا۔
"مانو روئے گی تو، نہیں۔"
"روئے گی تو ضرور، مگر ایک دو دن کے بعد چپ ہو جائے گی۔" شہباز نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
لڑکے نے بچہ شہباز کی گود میں دے دیا اور دونوں چند منٹ ٹھہر کر چلے گئے۔
شہباز گود میں بچے کو اٹھائے، سلاخوں کے پاس کھڑا، اونچے اونچے ہیبت ناک پہاڑوں کو دیکھنے لگا۔ آندھی چل رہی تھی، درختوں کی ٹہنیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ اپنی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اور چاول اس کے منہ میں ڈالنے لگا۔ وہ بار بار، باریک، کمزور آواز میں، میاؤں میاؤں کرتا اور مڑ مڑ کر دروازے کو دیکھتا۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش ہونے لگی.....
چاروں طرف ظلمت چھا گئی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر اندر آ رہے تھے۔ شدت کی سردی تھی۔ قیدی نے بچے کو گود میں چھپا لیا۔
وقت برابر گذرتا جا رہا تھا۔ شہباز کا کھانا اب ایک ورشت مزاج شخص لایا کرتا تھا۔ جس نے شہباز کے ساتھ کبھی بولنے کی کوشش نہ کی۔ بچہ اب بلی کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تمام امیدوں کا مرکز یہی بلی تھی، وہ بلی کو، جسے وہ پیار سے

اپنی محبوبہ کے نام پر "حمری" کہا کرتا تھا۔ بجیہ چاہتا تھا۔ یہ بے زبان جانور، یہ ننھی سی جان، یہ سفید بالوں میں لپٹی ہوئی معصوم روح اس کی غمخوار، ہمدرد اور انیس تنہائی تھی وہ شدت محبت سے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیتا تھا۔ اسے حمری کی نیلگوں آنکھوں میں محبت اور ہمدردی کی ایک دنیا آباد نظر آتی تھی، وہ اس کی ہر حال میں شریک غم تھی۔ جب وہ غمگین ہوتا تو وہ بھی غمگین صورت بنا لیتی، مایوسی سے اس کے چہرے کو دیکھتی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ اچھل کر گود میں بیٹھ جاتی، غمگین قیدی کا رنج دور ہو جاتا اور وہ خوشی خوشی اس کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ یونہی کافی عرصہ گزر گیا۔

شہباز کی طبیعت چند دن سے علیل تھی۔ اسے کھانسی آ رہی تھی۔ حمری پژمردہ سی ہو گئی تھی، اس کی تمام شوخی جاتی رہی تھی، قیدی لیٹے ہوئے، سینے پر اسے بٹھا کر اس سے باتیں کرتا۔ اسے اپنے واقعاتِ زندگی بتاتا، اسے اپنا واقعہ عشق سناتا اور پھر جب حمری کی وفات کا ذکر کرتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ معصوم حمری بھی اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے ننھے سے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ دو دن سے شہباز کی حالت بہت بگڑ چکی تھی، کھانسی کے ساتھ خون بھی آ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ابھی رات نہیں آئی تھی۔ مگر چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ قیدی نے اس چمک میں حمری کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو حمری کے گرد ڈال دیئے اور کمزور آواز میں کہنے لگا۔

"میری حمری! میں مر رہا ہوں — حمری! — میری حمری!!" وہ ذرا ٹھہرا، سینے میں سخت درد ہو رہا تھا — "میں مر جاؤں گا تو تو مجھے بھول جائے گی نا؟ حمری! ننھی حمری!!"

بد نصیب قیدی کی آواز آہستہ آہستہ رکنے لگی اور ایک آہ کے ساتھ اس کی آواز

ہمیشہ کے لئے رک گئی۔ قید خانے کی مختصر سی فضا میں بلی کی دردناک آواز گونجنے لگی۔ وہ کبھی قیدی کے سینے پر سر رکھتی۔ کبھی اس کے بازوؤں کو چھوتی، کبھی اس کی پیشانی پر منہ رکھ دیتی ہر طرف تاریکی تھی۔ بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ بلی کی دردناک آواز گونجتی رہی ——— آہ اس معصوم جانور نے تمام رات اپنے مالک کا ماتم کیا۔ صبح جمعدار جیل خانے کے چند ملازموں کے ساتھ شہباز کے کمرے میں آیا۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ وہ مرا پڑا ہے۔ اور اس کے سینے پر بلی لیٹی ہے۔ جمعدار نے بلی کو اٹھایا۔ وہ بے حس و حرکت تھی ——— بے حس و حرکت — مردہ!

ایک شام

اگست ۱۹۳۹ء

"کریمن!"

شیخ صاحب کی گرجتی ہوئی، غضبناک آواز فضا میں گونجی، بوڑھی کریمن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور وہ کونے دبک کر سہمی سہمی نظروں سے "ادھ منجھی" پتیلی کو دیکھنے لگی۔

"اب تمہارا کیا کام یہاں؟" شیخ صاحب اپنی چھڑی گھماتے ہوئے بولے!

"بیمار تھی شیخ جی!" بڑھیا نے نحیف و نزار آواز میں کہا۔

"بیمار؟ ہر روز یہی بہانہ بے شرم کہیں کی!"

"بیمار تھی شیخ جی — سچ کہتی ہوں"

"اور میں بھی سچ کہتا ہوں، اب تو یہاں نہیں رہ سکتی۔ منیر! فیروزہ سے کہہ دو۔ اس کا حساب صاف کر دے، ہم باز آئے ایسی ملازمہ سے"

کریمن کے ہاتھ سے رسی کا پھندا جس سے وہ پتیلی مانجھ رہی تھی زمین پر گر پڑا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی تاریک کنویں میں گر پڑی ہے۔ اس کے آقا کی غضبناک آواز اس کے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھی۔ جس طرح آندھی کے تیز و تند جھونکے قبرستان کی کسی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی دیوار سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے ہوں۔

"ایک دن بہانہ، دو دن بہانہ، مگر تم تو کچی بے شرم ہو چکی ہو۔ جس وقت لوگ کام کر کے گھروں کو جاتے ہیں اس وقت آپ مٹک مٹک کر کام کرنے کے لئے تشریف لاتی ہیں۔ مہربانی کر کے ہمیں اب معاف کیجئے۔"

بڑھیا نے بولنا چاہا، عذر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز رُک گئی۔ اس نے سرد آہ بھری اور اس کے تمام جذبات آنسوؤں میں تبدیل ہو کر اس کی پلکوں پر اس طرح لرزنے لگے۔ جس طرح چاند کے قریب گزرتے ہوئے کسی سیاہ بادل کا کوئی گوشہ روشن ہو جائے۔

دو چار باتیں اور کر کے شیخ صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب دالان میں سوائے کریمن کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ دو تین منٹ وہ گم سم پتھر کی مورتی بنی بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے فضا میں تاریکی کے بادل منڈلاتے رہے۔ نہ معلوم وہ کب تک اس طرح بیٹھی رہتی کہ منیر نے اس کے ہاتھ میں چند مختلف قسم کے سکے رکھ دیئے۔ یہ بڑھیا کی کئی راتوں اور کئی دنوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا۔

"یہ چار روپے سات آنے ہیں" منیر نے کہا۔

اس کے جواب میں بڑھیا نے سکوں کو ایک میلے کچیلے رومال میں باندھ کر جیب میں ڈال لیا۔

"تو آپ نے انہوں نے کاٹ لئے ہیں" منیر نے سرگوشی کے لہجے میں کہنا شروع کیا: "وہ کہتے ہیں تم نے ایک پلیٹ اور ـــــ"

بڑھیا نے آہ بھری۔ ایک قطرۂ اشک اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار کی جھریوں میں ڈوب گیا۔

"اب تم چلی جاؤ گی اماں؟"

"ہاں بیٹا! مجھے جانا ہی پڑے گا۔ انہوں نے مجھے نکال دیا ہے ـــــ اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔" یہ کہہ کر بڑھیا اٹھی اور دروازے کی طرف چلنے لگی۔ منیر وہیں کھڑا رہا۔ یکایک اوپر سے شیخ صاحب کی آواز آئی۔ "اوپر آؤ منیر!" منیر جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ بڑھیا نے دروازے کے پاس پہنچ کر، دیواروں پر، کھڑکیوں پر اور فرش پر الوداعی حسرت بھری نظر ڈالی اور دروازے سے نکلنے لگی۔ اوپر کھڑکیوں کو جنبش ہو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اور گھر کے دوسرے لوگ، بدقسمت بڑھیا کو رخصت ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مگر شیخ صاحب کے ڈر سے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتے تھے۔

آج سے نو سال قبل بڑھیا بڑے آرام اور چین کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ یکایک اس کا وفادار رفیقِ حیات جس نے بیس سال تک اس کی زندگی کا ساتھ دیا تھا، چند ہفتے بیمار رہ کر چل بسا۔ کرمین کی دنیا اندھیرے میں ڈوب گئی۔ مگر اس اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک ہر ضو و ارتھی۔ اور یہ روشنی کی لہر اس کا چودہ سالہ بیٹا تھا۔ ماں کی تمام دنیا سمٹ سمٹا کر بیٹے کے وجود میں سما گئی تھی، بیٹا ہی شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام امیدوں کا مرکز، اس کی تمام

مسرتوں کا سرچشمہ تھا۔ ریاض ہی اس کی تاریک دنیا کو روشن کر رہا تھا، ریاض ہی کے دم سے وہ زندہ تھی، ــــ زندہ رہنے کی آرزو مند تھی مگر بدقسمتی نے دوبارہ حملہ کیا۔ اور یہ حملہ پہلے حملے سے زیادہ شدید، زیادہ بےرحمانہ اور زیادہ تباہ کن تھا۔ اس کا نوجوان بیٹا مسلسل ۹ ماہ بیمار رہ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا۔ وہ بیٹے کی بیماری پر اُٹھ گیا۔ اور جب، بیٹے نے دنیا سے منہ موڑا تو گھر میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ایک سال تک تو زخم نصیب بیوہ گھر کے برتن وغیرہ بیچ بیچ کر گزارہ کرتی رہی اور پھر بالکل محتاج ہو کر شیخ صاحب کے یہاں ملازم ہوگئی اس طرح بیوہ کے ماتمی دن گزرنے لگے۔ کریمن نے انتہائی کوشش کی کہ اس کے فرائض میں ذرہ بھر کوتاہی نہ ہو۔ مگر بوڑھے بازو مشین نہیں بن سکتے تھے۔ شیخ صاحب کبھی کبھی اسے جھڑکنے لگے اور یکایک ایک دن یہ معاملہ جھڑک سے آگے نکل کر گالی گلوچ تک جا پہنچا۔ بات یہ ہوئی۔ کہ ملک خدا بخش اپنا مکان بیچ کر جہلم چلے گئے اور جاتی دفعہ اپنی نوکرانی کو جواب دے دیا۔ ان کی نوکرانی نازو اپنے شہر میں جانے سے پہلے دو ایک دن کے لئے شیخ صاحب کے ہاں کام کرنے ٹھہر گئی۔ شیخ صاحب کو نازو کا کام بہت پسند تھا۔ کیونکہ وُہ نوجوان تھی، بات کرنے کا سلیقہ جانتی تھی اور کام بھی نہایت احتیاط کے ساتھ کرتی تھی۔ ادھر یہ بیوہ تھی، کمزور بوڑھی اور بیمار، منیر نے کریمن سے تنہائی میں کہہ دیا تھا ــــ "شیخ صاحب نازو کو اپنے یہاں رکھنا چاہتے ہیں ــــ سمجھ لیا نا ــــ یہ بات ہے۔"

کریمن نے سب کچھ سنا، سب کچھ سمجھا۔ پھر بھی وُہ کام کرتی رہی۔ آخر کام نہ کرتی تو پیٹ کہاں سے بھرتی، مگر دو تین دن سے وہ سخت بیمار تھی، اس لئے وقت کی پابندی نہیں کرسکتی تھی، اور اس کا نتیجہ ــــ آج وہ گھر سے نکال دی گئی۔

آج اس کی زندگی کا آخری سہارا بھی اس سے چھن چکا تھا۔ زندگی کی آخری امید بھی ٹوٹ

چکی تھی۔ وہ سرخ چبوترے پر اپنا پاؤں رکھے چند منٹ کھڑی رہی۔ پھر آگے چلنے لگی۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ تنہائی میں جاکر اتنا روئے ـــ اتنا روئے کہ اس کی زندگی آنسوؤں میں بہ جائے۔ رونے کا خیال آتے ہی اس کی پژمردہ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ اس نے پھٹی پرانی قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے، بے کسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا۔ اور آگے بڑھنے لگی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور فضا میں بادل سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، تمام کائنات کسی تاریک غار میں جا رہی تھی، بیوہ کو پہلے بھی اپنی بدبختی کا شدید احساس تھا۔ مگر اب تو وہ خود کو دنیا کی بدنصیب ترین ہستی سمجھ رہی تھی، بارش ہونے لگی، قیمتی کپڑوں میں ملبوس لوگ گھبرا گھبرا کر تانگے والوں کو آوازیں دینے لگے۔ کہیں چلی جا رہی تھی ـــ بارش اور سردی کی شدت سے بے نیاز چلی جا رہی تھی۔ بے خودی کے عالم میں اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اور کہاں پہنچ گئی ہے، اس کی کوٹھڑی "چوک رحیم بخش" میں تھی۔ مگر وہ چوک کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ قادری دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک دم رک گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر سے بہت آگے آ گئی ہے۔ وہ دروازے کی دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کوئی شخص اپنے لڑکے کی انگلی پکڑے تانگے میں سوار ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ تانگے کو دیکھتی رہی۔ ایک سایہ سا اس کے سامنے پھرتا رہا اور پھر چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ـــ اب اس کے قریب سوائے ایک کتے کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ یہ دبلا پتلا زخمی کتا زمین پر دُم پھیر پھیر کر چیخ رہا تھا۔ ایک اور بدنصیب رُوح:

بدنصیب بیوہ کا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ زخمی کتے کو اپنے سینے سے لگالے، اپنے

سینے سے لگا کر خوب روئے ۔۔۔ بے قرار کُتا بارش میں بھیگتا ہوا کہیں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بیوہ کے سر پر پھڑ پھڑ کی سی آواز آنے لگی۔ اس نے اُوپر دیکھا۔ ایک ننھا سا پرندہ پروں کو پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بارش اور تاریکی نے اسے گھونسلے اور بچّوں سے جدا کر دیا تھا۔ ایک اور بدنصیب رُوح!

چند منٹ تک بڑھیا سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر اس کے قریب ہی سے آواز آئی:۔

"کوئی ہے خدا کا بندہ!"

بڑھیا نے اپنی داہنی جانب دیکھا۔ پانی میں تر ایک فقیر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

"ہاں بابا!" بڑھیا نے اس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کونسا دروازہ ہے بھائی؟"

"قادری دروازہ!"

"قادری ۔۔۔ در ۔۔۔ وازہ؟" فقیر نے حیرت و حسرت کے ملے جُلے لہجے میں کہا۔

"تم کہاں جاؤ گے بابا؟"

"چوک رحیم بخش میں مائی بساں کے تنور کے پاس سو رہتا ہوں۔"

"میں لے جاؤں گی تمھیں بابا!"

"آپ ۔۔۔ مائی؟ بڑی تکلیف ہوگی آپ کو۔ اگر آپ جیسے نیک لوگ دنیا میں موجود نہ ہوں تو ہم مر جائیں، اتنی سردی اور پھر بارش، توبہ ہے! آج پیسہ بھی کوئی نہیں ملا۔ تمام رات فاقے میں گزرے گی۔ اچھا رب مالک ہے۔ اسی نے پیدا کیا ہے ۔۔۔ وہی رزق دیگا۔"

معاً بڑھیا کی نگاہ فقیر کی پیشانی کے نیچے دو گڑھوں پر پڑی۔

"بابا تمھیں کچھ نظر نہیں آتا؟"

"میں اندھا ہوں مائی!"

"اوہو ——"

"بچپن میں اندھا نہیں تھا۔"

"پھر اندھے کیونکر ہو گئے؟"

"تقدیر مائی —— بیمار ہوا۔ تمام جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں۔ اس بیماری میں آنکھوں کا نور بھی جاتا رہا۔"

"تو بابا تمھارا کوئی گھر بار نہیں ہے؟"

"میں پہلے فقیر نہیں تھا۔ میرا بیٹا بڑا لائق تھا۔ وہ کماتا تھا اور ہم دونوں کھاتے تھے اسوقت مجھے کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کی۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" —— بڑھیا نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میرا بیٹا مر گیا —— میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔"

"میرا لعل بھی مر گیا تھا بابا!"

"تو تم بھی فقیرنی ہو؟"

"میں فقیرنی —— فق ——" بڑھیا کا دل بھر آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور عالم تصور میں دیکھنے لگی کہ وہ بارونق بازار میں ہاتھ پھیلائے مانگ رہی ہے۔

"تم چپ کیوں ہو گئیں مائی؟"

"میں فقیرنی نہیں ہوں۔"

"تو پھر؟"

"میں کچھ بھی نہیں ہوں ——— میں بدنصیب ہوں۔"

"مجھ سے بھی بڑھ کر بدنصیب ہو مائی؟"

بڑھیا فقیر کے چہرے کو دیکھنے لگی وہ صرف بیٹے سے محروم تھی۔ مگر اس کے سامنے کھڑا ہوا بدنصیب انسان، بیٹے کے علاوہ آنکھوں کے نور سے بھی محروم تھا۔ اس نے فقیر کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں ——— چیختا ہوا زخمی کتا ——— بچوں سے جدا ہو کر پھڑپھڑاتا ہوا پرندہ ——— بھیک مانگ کر پیٹ پالتا ہوا اندھا فقیر ——— تینوں بدقسمت ہستیاں اس کی نگاہوں کے سامنے رُونما ہو گئیں، سب کا دکھ اس کی روح میں تحلیل ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل کائنات جتنا وسیع ہو گیا ہے ——— اور کائنات کا تمام دُکھ اس کے دل میں سما رہا ہے۔

اُس نے فقیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بابا تم بڑے دکھی ہو۔"

اس کے جواب میں فقیر نے سرد آہ بھری۔

کریمن کے سینے میں چبھن سی ہوئی۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور تمام سکے نکال کر فقیر کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

"یہ کیا؟" فقیر نے سکوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"یہ تم لے لو، چار روپے سات آنے ہیں ———"

بوڑھا مبہوت و ششدر کھڑا تھا۔

"باندھ لو انہیں۔"

"تم ——— آپ ——— مائی جی؟"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں ——" بڑھیا نے کہا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت موجزن تھی——

"آپ کے پاس بڑی دولت ہو گئی ہے نا؟"

بڑھیا کو یہ فقرہ ناگوار گزرا، مگر——

"چلو بابا میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں، بارش تھم گئی ہے۔"

فقیر نے ایک میلا کچیلا بٹوہ نکالا۔ تمام سکے اس میں ڈال دیئے اور بٹوے کو واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ کرمین نے فقیر کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگی۔

"اب تو کئی ماہ تک تم بھیک نہیں مانگو گے ——" کرمین نے کہا۔ مگر فقیر اپنے خیالات میں غرق تھا۔ دونوں اس طرح قدم اٹھا رہے تھے۔ گویا انسانی دکھ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلے جا رہے ہیں۔

"آپ کتنی اچھی ہیں مائی جی!"

کرمین کچھ اور کہنے لگی تھی کہ اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اور جب کھانسی تھمی تو اس کی ٹھوڑی خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کسی نے اس کا گلا دبوچ لیا ہے اور سینہ کچل دیا ہے۔

"وہ سامنے ہے —— تن —— نور ——" بڑھیا نے بمشکل کہا۔

"اچھا —— خدا تمہارا بھلا کرے، میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں، وہاں —— تک چھوڑ آؤں —— تم —— ایں ——" یہ کہہ کر بڑھیا نے آگے قدم اٹھایا —— اور آگے —— اور آگے ——

"اب میں چلا جاؤں گا۔"

"بہت اچھا بابا!" ــــ کریمن نے کہا۔ اور کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا اب تنور کے قریب پہنچ چکا تھا۔

یکایک کریمن پر کھانسی کا ایک اور شدید دورہ پڑا اور وہ دھم سے، کیچڑ میں گر پڑی ــ

فقیر دُعائیں دے رہا تھا۔ "مائی جی! خدا تمہارا بھلا کرے ــ تمھیں کوئی دُکھ نہ پہنچے ــ ہمیشہ زندہ رہو ــ خدا دونوں جہان میں بھلا کرے۔"

افسانۂ خونچکاں

مارچ سنہ ۱۹۳۸ء

(۱)

"تنویر نے کتاب بند کر کے زانو پر رکھ دی۔ اور اپنی چھوٹی ہمشیرہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ شیریں کون ہے خورشید؟"

"بڑے بھولے بنتے ہیں آپ بھائی جان! مجھ سے پوچھ رہے ہیں شیریں کون ہے؟" خورشید نے سر کو خاص انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"وہی شریر لڑکی تو نہیں جو خیر سے ہمارے چچا غیاث کی صاحبزادی ہیں!" تنویر نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہی اَور کون ؟"

"اب سمجھا، کب نازل ہوگی ؟"

"آج، بلکہ ابھی"

"تو اس کے لئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں ؟"

"خاص تیاریاں تو نہیں"

"گھر کے کونے کونے میں ایک زبردست انقلاب ہو رہا ہے اَور تم کہتی ہو۔ کہ خاص تیاریاں نہیں"

"آپ تو ہر بات کا مذاق اُڑاتے ہیں بھائی جان !" خورشید نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ معمولی سی صفائی کو ایک زبردست انقلاب سمجھتے ہیں، خدا کی پناہ !"

"اچھا، تو بات یہ ہے۔ جب وہ بلا نازل ہو جائے مجھے اطلاع دینا — فی الفور یہاں سے بھاگ جاؤں گا !"

"آپ تو اس بلا کے لئے سٹیشن پر موٹر لے جا رہے ہیں۔"

"یہ تم کو کس نے کہا ؟" یہ کہتے ہوئے تنویر کا چہرہ قدرے خشمناک ہو گیا۔

"آپ نے، ابا جان نے اَور......"

"قطعاً نہیں، لوگ بلا کا نام سن کر بھاگ جائیں اور تم مجھے اس کو سٹیشن سے لانے کے لئے کہو۔ میں باز آیا اس قدر افزائی سے !"

"آپ ہمارا مذاق اُڑا سکتے ہیں۔ مگر باجی شیریں کے سامنے آپ میاں مٹھو بن جائیں گے۔" خورشید نے ہنس کر کہا۔

"میاں مٹھو !"

"اور کیا، ہماری باجی اتنی حاضر جواب ہے اتنی حاضر جواب ہے کہ....."

"کہ کوئی شخص اس کے سامنے حاضر ہی نہیں ہو سکتا، یہی مطلب ہے نا؟"

دونوں پھر ہنس پڑے۔

"تو آپ جائیں گے نا بھائی جان؟"

"ابا جان چلے جائیں گے۔"

"وہ تو ضرور جائیں گے مگر موٹر کی بھی تو ضرورت ہے نا!"

"تو گویا مجھ سے ڈرائیور کا کام لینا چاہتی ہو!"

"یہ بات نہیں بھائی جان!"

"تو اچھا کوئی اور بات سہی..... لیکن میں جاؤنگا نہیں!"

"آپ کو جانا ہوگا..... اور آپ ضرور جائیں گے!" یہ کہکر خورشید تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل گئی۔

خورشید کے جانے کے بعد تنویر نے کتاب کی طرف توجہ کی مگر مطالعے پر اس کا جی نہ لگا اور اس کی انگلیاں بے پروائی سے کتاب کی ورق گردانی کرنے لگیں۔ ایک دو منٹ تک یہ شغلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس نے کتاب کو پھر زانو پر رکھدیا اور دایاں ہاتھ کوچ کے بازو پر رکھتے ہوئے خیالات میں محو ہو گیا۔ بے اختیاری کے عالم میں اس کے لب تھرتھرائے۔ اور ان میں سے ایک ہلکی سی آواز شیریں کہتی ہوئی پیدا ہوئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں، مدت سے سویا ہوا جذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا اور وہ تصورات کی رَو میں بہتا ہوا بیس سال قبل کے زمانے کی معصوم آغوش میں جا پہنچا۔ گزشتہ مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ اُس وقت اس کی عمر نو دس سال کے قریب تھی اور زندگی کا ہر دور اس کے لئے

ہزار در ہزار دلچسپیاں لئے ہوئے تھا۔ وُہ ہر روز اپنے مکان کے پائیں باغ میں پھولوں سے لدی ہوئی روشوں پر طرح طرح کے کھیل کھیلتا۔ طرح طرح کی دلچسپیوں میں حصہ لیتا، ان تمام کھیلوں، ان تمام دلچسپیوں میں ایک اور ہستی بھی حصہ لیتی تھی، اور وُہ تھی اس کی بنتِ عم، شیریں، نو سال کی شریر لڑکی، یہ زمانہ بچپن کا معصوم زمانہ تھا۔ اور ان کی محبت بچپن کی معصومانہ محبت کا رنگ لئے ہوئے تھی، اس کے بعد وُہ زمانہ آیا جب وہ عالمِ بلوغت میں قدم رکھ رہے تھے۔ ان کی محبت اور کیفیت اختیار کرنے لگی۔ تنویر شیریں سے لاکھ بے تکلف ہونے کے باوجود جب اس کے رُوبرو آتا۔ تو اس کا دل دھڑکنے لگتا، شیریں، تنویر کو بچپن کا ساتھی سمجھتے ہوئے بھی جب اس کے قریب آتی تو شرم و حیا کی سُرخی اس کے چہرے پر دوڑ جاتی، بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُور رہتے اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے دُور ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔ زندگی کے مختلف فرائض نے انہیں مصروف انسان بنا دیا۔ تاہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے لئے مضطرب رہتیں، دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے رہتے۔

اس کے بعد وُہ زمانہ آیا، جب تنویر تکمیل تعلیم کے لئے عازمِ یوروپ ہوا۔ دونوں آخری بار ملے۔ دونوں نے رسمی گفتگو کرنے کے باوجود وُہ راز، جو وہ ہزاروں بار نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو بتا چکے تھے، چند لمحوں میں بزبانِ خاموشی آخری بار ایک دوسرے کو بتا دیا۔ تنویر یورپ چلا گیا۔ اجنبی ملک کی رنگینیوں اور دلچسپیوں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک ان میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ تاہم کبھی کبھی شیریں کی یاد شراب کی ایک لہر بن کر اس کے دماغ میں دوڑ جاتی، اور جب وُہ یہ خیال کرتا کہ اس کی بنتِ عم ہزاروں میل کے فاصلے پر اس کا انتظار کر رہی ہے تو اضطراب انگیز مسرت اس پر چھا

جاتی اور وہ گھنٹوں گزشتہ واقعات کے آغوش میں محو رہتا۔

مکمل چھ سال کے بعد وہ یورپ سے واپس آیا۔ مگر بہت بدلا ہوا، تہذیب جدید نے جہاں اس کے خیالات پر اثر کیا تھا، وہاں اس کی معاشرتی زندگی کو بھی بدل دیا تھا۔ اپنے وطنِ مالوف میں آتے ہی اسے ایک ممتاز کالج میں لیکچرار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کا جدید دور تھا۔

اس جدید دور میں وہ گزشتہ عقائد و خیالات کی زنجیر سے آزاد تھا۔ اسی اثنا میں اس نے سنا کہ شیریں کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے دل کو سخت رنج پہنچا۔ اس نے کوشش کی کہ شیریں کی یاد کو فراموش کر دے۔ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو گیا۔ علمی اشغال نے پوری طرح اس کی توجہ پر قابو پا لیا۔ اور اس وقت کہ شیریں کی شادی کی خبر کو سنے اسے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ گزشتہ محبت قریباً قریباً ایک خواب بن چکی تھی۔

وہ اپنے خیالات میں غرق تھا کہ اسے قہقہے سنائی دیئے اور اس کے ساتھ ہی خورشید کی آواز آئی۔ اس نے آواز دی۔ چند لمحوں کے بعد خورشید اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ بلا نازل تو نہیں ہو گئی؟" تنویر نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں، وہ خود آ گئیں۔"

تنویر نے خورشید کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ تھا۔

"اچھی بات ہے۔"

"وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"جھوٹ کہتی ہے!"

"اچھا جھوٹ ہی سہی، آپ نہ جائیں وہ خود تشریف لے آئیں گی۔"

"انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ میری مرضی ہے۔"

"اور ان کی مرضی ہے کہ وہ یہاں آئیں" یہ کہہ کر خورشید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور چلی گئی۔

تنویر اٹھا، کتاب کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور الماری میں رکھ کر ایک اور مجلد کتاب نکالی۔ دو تین منٹ تک اسے سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد اس کی طبیعت بیزار ہو گئی وہ کتاب بھی اس نے وہیں رکھ دی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے اپنی کمزوری پر شرم سی آئی۔ اس نے جلدی سے الماری کو مقفل کیا۔ یکایک گھڑی نے نو بجائے۔ اس نے بعجلت کپڑے بدلے۔ دس بجے اسے کلاس لینی تھی، مگر آج وہ ایک گھنٹہ پیشتر ہی کالج کو جا رہا تھا۔

(۲)

جب سے تنویر نے شیریں کی آمد کی خبر سنی تھی۔ اس کا دماغ اضطراب زا خیالات کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ مضطرب تھا اور غیر محسوس طور پر اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا ایک غیر مبہم سی خواہش، ایک دھندلی سی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ "اس بے چینی کا کیا سبب ہے؟" وہ سوچتا۔ "میں شیریں کو قطعاً کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ایک مدت ہوئی میرے اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے۔ اور یہ تعلقات محبت کی صورت بھی اختیار کر چکے تھے۔ مگر اب انہیں یاد کرنے سے فائدہ؟ گزشتہ واقعات خواب و خیال بن جاتے ہیں۔" اس خیال سے وہ اپنے دل میں بے چینی کو دور کرنے کی کوشش کرتا اور اس میں

کامیاب بھی ہو جاتا۔ سکون کی کیفیت اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی۔ مگر جس طرح متحرک پردے کا سایہ ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ اس طرح اس کی یہ کیفیت بھی چند لمحوں سے زیادہ قائم نہیں رہتی تھی۔

اپنے متعینہ فرائض ادا کرنے کے بعد وہ کالج سے نکلا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات اسے پریشان کرتے رہے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی نازک قہقہوں کی آواز اس کے کان میں گونجی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اسی حالت میں وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ہیٹ اتار کر کھونٹی سے لٹکائی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے لگا۔۔ اسے بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے سے ہلکی سی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچا اور باہر دیکھنے لگا۔ ایک طرف خورشید کھڑی مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بھائی جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ باجی شیریں آپ کو کئی بار یاد فرما چکی ہیں مگر آپ ......" یہ کہکر خورشید گردن لٹکا کر خاموش ہو گئی۔

"میں ابھی ابھی کالج سے آیا ہوں، کہاں ہے وہ بل......"

یکایک خورشید نے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے "او" کی سی آواز نکالی۔ تنویر نے خاموش ہو کر بائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظر قریب ایک مسکراتے ہوئے دل آویز چہرے پر پڑی، یہ شیریں تھی۔

"خاموش کیوں ہو گئے آپ؟" شیریں نے کہا۔ "لگے ہاتھوں کوئی خطاب دے دیجئے!"

"تم خود آ موجود ہوئیں شیریں!"

"جی ہاں، میں نے کہا پروفیسر صاحب قبلہ کی خدمت میں خود حاضر ہو جاؤں.... وقت

زیادہ قیمتی تو نہیں؟"

"میں ابھی ابھی کالج سے آیا ہوں .... تمہاری طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا..."

"کہ راستے میں پہاڑ حائل ہو گیا۔" شیریں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"خوب! تم ابھی پہلی سی ہی شریر لڑکی ہو شیریں!" تنویر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، اور آپ بھی پہلے سے حیلہ جو ہیں!"

آؤ اندر ...... بیٹھ جاؤ!"

"آئے ہیں تو بیٹھ ہی جائیں گے۔" شیریں نے اپنی بہن زبیدہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ـــ

چاروں اندر آ گئے۔ دونوں بہنیں کوچ پہ بیٹھ گئیں۔ تنویر کرسی پر بیٹھ گیا اور خورشید اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آج کل آپ بہت مصروف ہیں۔ کیوں پروفیسر صاحب؟" شیریں نے پوچھا۔

"خاص مصروف تو نہیں ..... لیکن ....."

"لیکن اتنا وقت نہیں ملتا۔ کہ کسی مہمان کے لئے چند منٹ نکال سکیں۔" شیریں نے تنویر کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال غلط تھا ..... تم تو خدا کے فضل سے شوخ بیانی میں پہلے سے بھی بڑھ کر ہو۔" تنویر بولا۔

"اب معلوم ہوا بھائی جان! میں نے سچ کہا تھا نا؟" خورشید نے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا کہا تھا ؟" شیریں نے پوچھا۔

"میں نے کہا تھا کہ ..... خیر چھوڑیئے اس بات کو !"

"تم کیوں نہیں بولتیں زبیدہ ! تمھاری بہن کی زبان تو قینچی کی طرح چل رہی ہے !" تنویر نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"میرا فرض بھی باجی ادا کر رہی ہیں ۔" زبیدہ نے کہا۔

"اِس قسم کا قرض تو وُہ تمام دُنیا کا ادا کر سکتی ہے .... تاہم تم بھی کچھ کہو کیا حال ہے ؟"

"ہمارا جو حال ہے ، سو ہے ، آپ اپنا بتایئے ۔ ولایت میں کیسی گزری ؟" زبیدہ نے پوچھا۔

"یہ بات تو پُرانی ہو چکی" تنویر نے جواب دیا ۔

"پرانی ؟" زبیدہ نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔

"اِن کے لئے توکل کی بات بھی بہت پُرانی ہے ۔" شیریں بولی

"اس سے اندازہ لگا لیجئے ۔ جب میں نے کہا باجی شیریں آ رہی ہیں تو کہنے لگے کون شیریں ؟" خورشید نے شیریں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ ! ...." شیریں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کے دماغ میں تو ولایت بسی ہے ۔"

"بات کچھ اور تھی شیریں ! جب خورشید نے کہا شیریں آ رہی ہیں ۔ اس وقت میں "شیریں فرہاد" کا قصہ پڑھ رہا تھا ۔ شیریں کا نام سُن کر میں نے سمجھا ...."

"آپ نے سمجھا کہ فرہاد والی شیریں آ رہی ہے ۔ اور آپ کو سخت حیرت ہوئی کہ

مُردہ کیونکر زندہ ہو گیا۔ یہی بات ہے نا؟"

تنویر بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہاں کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا!"

"خدا کرے یہ خطرناک واقعات ہر روز پیش نہ آئیں۔"

"وظیفہ پڑھ کر دُعا کیا کرو!" تنویر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"آپ ماشاء اللہ خود زاہد ہیں یہ فرض انجام دے لیا کیجئے!"

"ان باتوں کو چھوڑیئے بھائی جان! باجی کی حاضر جوابی کے سامنے آپ کی ایک نہیں چلے گی۔ کچھ ولایت کے حالات سنایئے!" زبیدہ نے اشتیاق انگیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ باجی شیریں کی حاضر جوابی اپنی مثال آپ ہے۔" زبیدہ بولی۔

"یہ شریر لڑکی بچپن میں بھی مجھے تنگ کیا کرتی تھی" تنویر نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دن یاد ہیں شیریں! جب ہم دریا کے کنارے کھیلا کرتے تھے"

"کیوں نہیں، وہ دن کیونکر بھول سکتے ہیں۔ جب آپ چیختے چلاتے میرے پیچھے بھاگا کرتے تھے۔"

"میں چیختا چلاتا تھا؟" تنویر نے قدرے شرمندہ ہو کر پوچھا "یہ عادت تو تم میں فطرت ثانیہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ادھر میں نے گڑیا کو چھپایا ادھر تم نے چیخیں مارنی شروع کر دیں۔"

"زبیدہ!" شیریں نے بہن کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ "یہ چیختے چلاتے تو قطعاً نہیں تھے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ رونے والا ریکارڈ بج رہا ہے۔"

اس پر تمام ہنس پڑے۔

"سُنا ہے آپ آج کل افسانہ نگاری کا شوق بھی کیا کرتے ہیں؟" شیریں نے پوچھا۔

"ہے تو درست! تم کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔ میں تو خوش ہوں کہ ہمارے بھائی جان کی بے شمار خصوصیات میں ایک زبردست خصوصیت کا اضافہ ہوا۔" شیریں بولی

"تو ہمیں کوئی افسانہ سنایئے نا" زبیدہ نے التماس کی۔

افسانہ سنایا نہیں جاتا، پڑھا جاتا ہے۔"

"یہی تو زبیدہ کہہ رہی ہے۔ آپ اپنا افسانہ پڑھ دیں۔" شیریں نے جلدی سے کہا۔

"کوشش کرونگا!"

"کب؟ ہم تو آج ہی سنیں گے!" زبیدہ نے مُصر ہو کر کہا۔

"میں نے تازہ افسانہ کوئی نہیں لکھا!"

"تو پُرانا ہی سہی۔"

"غور کرونگا۔"

"اچھا میرا فیصلہ یہ ہے کہ آپ کا افسانہ رات کو سُنیں گے!" شیریں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"سینما کا بھی تو پروگرام ہے!" زبیدہ بولی۔

"اس کے علاوہ اور بھی پروگرام ہیں ان میں یہ پروگرام بھی شامل کر لو۔"

اس کے بعد مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ جب تنویر اکیلا رہ گیا۔ تو اُسے

محسوس ہونے لگا۔ گویا اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہے، وُہ سوچنے لگا کیا یہ وہی شریر لڑکی ہے۔ جو بچپن میں طرح طرح کی شرارتوں سے اسے تنگ کیا کرتی تھی جس کی محبت نے اس کے لئے کائنات کی ہر شے کو حسین بنا دیا تھا۔ جو اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ دیر تک اپنی تصورات میں محو رہا...... ہر لمحہ شیریں کا مسکراتا ہوا دلآویز چہرہ اس کے سامنے پھر رہا تھا۔

(۳)

زمین دوز ندی ہماری نگاہوں سے پنہاں، اپنے راستے پر بہتی رہتی ہے۔ یکایک زمین کے سینے میں ایک معمولی سا سوراخ پیدا ہوتا ہے۔ اور پانی سیلاب کی صورت میں باہر نکل کر آناً فاناً ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ یہی حال تنویر کے ساتھ پیش آیا۔ شیریں کی محبت کا جذبہ اس کے سینے کی گہرائیوں میں سو چکا تھا۔ لیکن جب اس کی نگاہوں کے سامنے شیریں کا دلآویز چہرہ آیا۔ تو اس کے دل کے ذرے ذرے میں ہیجان برپا ہو گیا۔ بچپن کے سہانے خوابوں کی غیر مرئی انگلی نے اس کے بربطِ دل کا وُہ تار چھیڑ دیا جو ایک مدت سے خاموش تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ شیریں اس کے سامنے رہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ یہ خواہش زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اسوقت بھی وہ اپنے کمرے میں کوچ پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد شیریں تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے بھائی جان ؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" تنویر نے جواب دیا

"کیا ہے وُہ ؟"

"ایک افسانہ ہے !"

"افسانہ، خوب ! معلوم ہوتا ہے کل کے فلم نے آپ پر خاص اثر کیا ہے !"

"خاص اثر؟"

"جی ہاں ، جبھی تو آپ افسانہ لکھ رہے ہیں !"

"تو تمھارا خیال ہے میں فلم کو افسانے میں منتقل کر رہا ہوں ؟"

"میں نے تو یہ نہیں کہا بھائی جان ! اور ہاں ....."

"کیا بولو !"

"مجھے اس وقت ایک عجیب و غریب ضرب المثل یاد آئی ہے ۔ اجازت ہو تو کہدوں !"

"تمھیں روکتا کون ہے ؟"

"وہ ضرب المثل ہے .... کیا ہے وہ ؟ ہاں یاد آئی چور ...... کی داڑھی میں تنکا !"

یہ کہتے ہوئے شیریں نے قہقہہ لگایا ۔

"مجھے چور سمجھ رہی ہو !"

قطعاً نہیں ، یہاں تو اس چور کا ذکر ہو رہا ہے جس کے داڑھی ہے اور آپ تو خدا کے فضل سے مونچھوں کا بھی صفایا کر دیتے ہیں ۔"

"ہش !"

"یہ ہش کیا ہے بھائی جان ! مجھے آپ نے کوئی پرندہ سمجھ رکھا ہے ؟"

"ہاں ، اور وہ بھی بلبل ۔"

"اور اگر میں بھی آپ کو کوئی خوبصورت جانور سمجھ لوں تو ؟"

"پٹ جاؤ گی !"

"اور پیٹنے والے خیر سے آپ ہوں گے ؟"

"ہاں ، بچپن میں بھی میں تمھیں پیٹا کرتا تھا !"

"کب! کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں شیریں..... ایک خواب تو دیکھا تھا۔ مگر اس کی تعبیر....." تنویر کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

"کچھ یاد آگیا؟"

"بہت کچھ یاد آگیا..... کاش..... ہاں تم افسانہ سنو گی؟ غیر مکمل ہے۔"

"سنوں گی مگر زبیدہ کو بھی آجانے دیجئے۔"

"میں تو اب سنانے کے لئے تیار ہوں۔ آئندہ منت وسماجت بھی کرو گی، جب بھی......"

"آپ ٹس سے مس نہیں ہونگے، یہی کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"ظاہر ہے!"

"تو بسم اللہ!"

"بہتر" یہ کہہ کر تنویر نے پیشانی پر ہاتھ رکھا اور خاموش ہو گیا۔

خاموش ہو گئے آپ، سناتے نہیں!"

"تم نے جو کہا تھا بسم اللہ..... یعنی....."

"یعنی آپ سنایئے!"

تنویر کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے میز کی دراز میں سے ایک کاپی نکالی۔ اور اسے اپنے سامنے کھول کر شیریں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"زبانی سنانے کا ارادہ ہے؟"

"پڑھ کر سناتا ہوں۔ غیر مکمل ہے۔"

"آپ سنایئے غیر مکمل ہے تو کیا ہوا؟"

تنویر کاپی کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دایاں ہاتھ ایک صفحے پر رکھ دیا۔ "اس افسانے کا عنوان بھی ابھی قائم نہیں ہوا۔ کیونکہ ابھی مکمل نہیں لکھا گیا۔"

"تو پھر" شیریں نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا عنوان 'غیر مکمل افسانہ' ہی کیوں نہیں رکھ دیتے؟"

تنویر نے ایک آہ بھری اور پڑھنے لگا۔ "حمید کو اپنی چچا زاد بہن سے اس درجہ محبت تھی کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے جدا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی حال سلیمہ کا بھی تھا۔ اس کے لئے بھی حمید سے علیحدہ رہنا ایک سخت تکلیف دہ امر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ بچے تھے۔ دونوں ہر روز پہروں باغ میں کھیلتے رہتے۔ کبھی حمید سلیمہ کی گڑیا کسی پودے میں چھپا دیتا۔ کبھی موقعہ پا کر سلیمہ حمید کی کتاب غائب کر دیتی، دونوں لڑتے جھگڑتے۔ مگر یہ لڑائی یہ جھگڑا ان کی محبت کی آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ .... بچپن کی محبت بھی عجیب ہوتی ہے" — وہ ذرا ٹھہرا اور شیریں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "تمہارا کیا خیال ہے شیریں!"

"آپ پڑھتے جایئے ...... سوال و جواب بعد میں ہو جائیں گے!" شیریں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے تو سنتی جاؤ۔ آخر انہوں نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی محبت نے بھی باقتضائے وقت اور رنگ اختیار کر لیا۔ بچپن کی معصوم محبت کے آغوش میں شباب کی رنگین آرزوئیں انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اور وہ تمنائیں جو دورِ طفلی کے ذہن پر سادہ خواب بن کر چھائی ہوئی تھیں۔ نوجوانی کے نشے کی تندو

تیز لہروں میں تبدیل ہو گئیں۔ حمید کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا۔ کہ سلیمہ اس کی ہے، اور اسی کی رہے گی۔ سلیمہ کا بھی ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو حمید سے جدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔.....“

تنویر ذرا ٹھہر گیا۔ ”ابتدا اچھی ہے نا شیریں!“

شیریں نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ اور تنویر آگے پڑھنے لگا۔ ”حمید تکمیلِ تعلیم کی غرض سے یورپ چلا گیا۔ وہاں جا کر گوناگوں دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی محبوبہ کو فراموش نہ کیا۔ اور کر ہی کیونکر سکتا تھا۔ اگر محبت کا زخم مندمل ہو سکتا۔ تو انسانی زندگی کی تاریخ، عشق کی تباہ کاریوں سے خالی ہوتی۔ محبت کو سینے کا داغ کہتے ہیں۔ کاش یہ داغ ہی ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ داغ زخم بن کر گہرا ہوتا جاتا ہے۔ حمید کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ اپنے علمی فرائض ادا کرنے کے بعد وہ اپنے وطن میں آیا...... اس حالت میں آیا کہ ہزاروں آرزوئیں اس کے سینے میں ہجوم برپا کئے ہوئے تھیں، اور ہزاروں خواب اس کی روح کے افق پر جھلملا رہے تھے۔ زمانے کو محبت سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے۔ یہاں بھی اس ظالم نے اپنی چال چلی۔ حمید نے وطن پہنچکر سنا کہ اس کی محبوبہ کی کہیں شادی ہو گئی ہے۔ یہ سن کر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ سلیمہ اس کی راحت تھی، اس کا چین تھی...... اور اب وہ اپنی راحت، اپنے چین سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ سلیمہ کو فراموش کر دے مگر......

عشق پہ زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ۔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

حمید کی حالت قابلِ رحم تھی، کاش وہ سلیمہ کو فراموش کر دیتا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار سے باہر تھی، عورت فطرتاً کمزور ہوتی ہے، اور محبت کے معاملے میں تو اس کی کمزوری کبھی نظر انداز

نہیں کی جا سکتی۔ سلیمہ کو خیال ہونا چاہیئے تھا کہ حمید اس سے جدا ہو کر، اپنی زندگی کی مسرتوں سے محروم ہو جائے گا۔ ...... لیکن وُہ خیال کیوں کرتی۔ کمزور فطرت عورت ......"

تنویر نے انکھیوں سے شیریں کو دیکھا۔ شیریں کے چہرے کا رنگ بدلا ہُوا تھا۔ اور وُہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"میں نے افسانہ یہیں تک لکھا ہے۔" تنویر نے کہا "کچھ پسند آیا؟"

"خوب ہے مکمل کر لیجئے!"

"جب لکھا ہے تو مکمل کرنا پڑے گا۔ مگر یہ افسانہ اپنی نوعیت کا واحد افسانہ ہے، دیکھئے کیونکر مکمل ہوتا ہے۔"

شیریں ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ "مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے بھائی جان!" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جب جاؤ لے جانا!"

"شکریہ! ...... آپ بڑے مہربان ہیں بھائی جان!"

"تم تو جا رہی ہو!"

"اب نیند آ رہی ہے ...... شاید آپ کو نیند نہ آ رہی ہو۔ آخر افسانہ نگار جو ہوئے ـــ"

"گویا افسانہ نگار کو نیند نہیں آتی؟"

"اگر آتی ہے تو چپکے سے سو جائیے!" یہ کہکر شیریں نے مسکرا کر تنویر کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

اس واقعے کے بعد شیریں کی طبیعت میں بظاہر وہی شوخی، وُہی شرارت تھی تاہم

وہ بے تکلفی جس کا مظاہرہ وہ تنویر کے سامنے کیا کرتی تھی، اب ایک حد تک دور ہو چکی تھی۔ وُہ دو دن اَور وہاں رہی پھر جالندھر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تنویر کو دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ آخر اس تاریک دنیا میں روشنی کی ایک کرن چمکی، یعنی تنویر کی شادی ہوگئی۔

(۴)

سعیدہ تنویر کی وفادار بیوی ہی نہیں بلکہ اس کی پرستار بھی تھی، اس کے وفادارانہ جذبات کا اقتضا تھا کہ وُہ تنویر کی مسرت و غم کو اپنی مسرت و غم سمجھے۔ اَور اس کے پرستارانہ جذبات متقضی تھے کہ وُہ تنویر کو ایک پجارن کی طرح پوجے۔ اَور وُہ دونوں فرض ادا کر رہی تھی۔ تنویر سب کچھ دیکھنے کے باوجود، خاموش، گم سم نظر آرہا تھا۔ ذہنی کشمکش کے لحاظ سے وُہ درخت کے اس پتے کی مانند تھا جو شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے تھپیڑے کھاتا ہوا کبھی فضا میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے اَور کبھی ہوا کے تھم جانے پر زمین کے قریب آجائے اس کی زندگی اپنے دامن میں ایک نئے انقلاب کی پرورش کررہی تھی، اپنے موجودہ حالات پر غور کرتے ہوئے جب اس کی بیوی کا معصوم چہرہ اس کے سامنے آجاتا تو اس کی زندگی کے ساکن سمندر میں ایک تلاطم بپا ہوجاتا، مگر یہ تلاطم چند لمحوں کے بعد سطحِ آب پر چند حقیر بلبلے چھوڑ کر غائب ہوجاتا۔ پھر شیریں کی یاد طوفان بن کر آتی۔ مگر یہ طوفان بھی کچھ دیر گزرنے پر چند کمزور لہروں کی صورت اختیار کرلیتا۔ سعیدہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا عزیز شوہر غمگین رہتا ہے۔ کیوں؟ یہ ایک راز تھا جس سے وہ قطعاً آشنا نہیں تھی۔ تاہم اس کی پُرجوش محبت میں ذرہ بھر کمی نہیں ہوئی تھی۔

شادی سے دو مہینے پیشتر تنویر نے شیریں کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ جس میں طوفانی

جذباتِ محبت کے اظہار کے بعد تحریر کیا تھا۔ "شیریں! تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو؛ تم نے مجھے بھلا دیا۔ مگر میں تمھیں نہیں بھلا سکتا۔ میں تمھیں صاف طور پر بتائے دیتا ہوں کہ اگر میری بیتابانہ محبت کی یہی کیفیت رہی۔ تو زندگی میرے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائے گی"۔۔ اس کے جواب میں شیریں نے اس کی ہونے والی بیوی کی بے شمار خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے جلد شادی کرنے پر اصرار کیا تھا۔

شادی ہوگئی اور ایک سال بھی گزر گیا۔ اس اثنا میں نہ تو تنویر نے شیریں کو کوئی خط بھیجا اور نہ شیریں نے تنویر کو کچھ لکھا۔ ایک دن شام کے وقت تنویر کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ اس کے نام ایک تار آیا۔ جس میں لکھا تھا: "اصغر علی فوت ہوگئے ہیں" یہ الفاظ پڑھتے ہی تنویر کی رگوں میں خون کی گردش دم بھر کے لئے سست ہوگئی۔ سید اصغر علی یعنی شیریں کے شوہر کی وفات اسے ایک معجزہ معلوم ہوئی۔ اسی شام کو وہ بیوی کے ساتھ جالندھر روانہ ہوگیا۔۔۔ شیریں کی آنسو بھری آنکھوں نے اپنی مصیبت کا اظہار کیا۔۔ اور تنویر کی ہمدرد نگاہیں پیامِ تسکین دینے لگیں۔ کون جانتا تھا کہ ان ہمدرد نگاہوں کے پیچھے ایک اور جذبہ بھی انگڑائیاں لے رہا ہے۔

چند دن ٹھہر کر تنویر اور سعیدہ واپس آ گئے۔ آتی دفعہ تنویر نے شیریں سے وعدہ لے لیا۔ کہ وہ ایک آدھ ماہ کے بعد ان کے ہاں آئے گی۔ جس دن شیریں آئی تنویر بہت خوش تھا اور چونکہ حیاتِ ازدواجی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سعیدہ نے تنویر کو اس قدر مسرور دیکھا تھا۔ اس لئے وہ بھی بے حد خوش تھی۔

شیریں کو آئے ہوئے پانچ دن گزر چکے تھے۔ اس اثنا میں سعیدہ کو شیریں سے کافی محبت ہوگئی تھی۔ قریباً ہر روز شام کے وقت تنویر، سعیدہ اور شیریں سیر کو جاتے تھے۔ آج

بھی بسیر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سعیدہ کی طبیعت خراب تھی۔ اس لئے اس نے جانے سے معذرت کرلی۔ شیریں نے بھی سعیدہ کی ناسازیٔ طبع کو بہانہ بنا کر انکار کرنا چاہا۔ مگر تنویر کے اصرار کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ دونوں ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ رسمی باتیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ان کا ٹانگہ آبادی سے دُور نکل گیا۔ دونوں ٹانگے سے اُترے اور ایک ویران راستے پر چلنے لگے۔

آسمان کی وسعتوں سے تاریکی کے کثیف بادل گزر رہے تھے۔ مغرب کے خونیں گوشے میں افسردہ رُو آفتاب، طوفان کی ہمگیں موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر، ڈوبتے ہوئے جہاز کی مانند غروب ہو رہا تھا۔ تنویر کی نگاہیں قریب ایک درخت پر جمی تھیں۔ یکایک اس نے شیریں کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ ایک کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور دوسرے کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"شیریں!" تنویر نے مدھم آواز میں کہا۔

"کیوں تنویر!"

"حیرت ہے حالات نے کس طرح پلٹا کھایا ہے!"

"کونسے حالات نے؟"

"ہمارے حالات نے شیریں! میری تمنائیں خاک میں مل چکی تھیں۔ مگر حالات کے تغیر نے مُردہ آرزوؤں میں پھر خونِ حیات دوڑا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے شیریں کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ شیریں ٹکٹکی باندھے، دُور ایک جھونپڑی کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا اب بھی تم مجھے مایوس کر دو گی شیریں؟"

شیریں خاموش رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں شیریں؟"

"تم جو بول رہے ہو، میرے بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اب بھی میرے جذبات سے کھیل رہی ہو؟"

شیریں کے چہرے کا رنگ اور متغیر ہو گیا۔ اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تنویر! میں نہ تو تمہارے جذبات کے ساتھ کھیلتی رہی ہوں، اور نہ اب کھیل رہی ہوں۔ حالات بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ اس میں نہ میرا قصور ہے نہ تمہارا!"

"تو پھر..... میں کیا سمجھوں؟ میری دنیا تاریک ہی رہے گی؟"

"تمہاری دنیا کیوں تاریک ہونے لگی!"

"اب مذاق نہ کرو شیریں! تم میری تھیں ..... کیا اب پھر میری ....."

"میں تمہاری ہوں ..... مگر تم میرے نہیں ہو سکتے" شیریں نے کہا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں۔

"تم میری ہو شیریں میری ..... ہم جدا نہیں ہو سکتے۔" یہ کہتے ہوئے محبت سے مخمور تنویر نے شیریں کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ایک دو لمحے شیریں بے حرکت کھڑی رہی ..... پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اُٹھنے لگے۔ اور تنویر کی گردن میں حمائل ہو گئے .....

گھنٹوں سرمست محبت روحیں محبت کے راز و نیاز میں محو رہیں۔ یکایک شیریں اٹھ بیٹھی۔ "اب ہمیں چلنا چاہیئے!" اس کے لبوں سے نکلا۔

تنویر با دلِ ناخواستہ اٹھا اور وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کا تانگہ نکلسن روڈ

پر جا رہا تھا۔ کہ سامنے سے دو موٹریں آئیں، ایک تو تانگہ کے پاس سے گزر گئی اور دوسری گھوڑے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ گھوڑا بدکا۔ تنویر نے شیریں کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر دونوں گر پڑے۔ تنویر کو دو تین زخم آئے۔ مگر شیریں کو کافی چوٹیں پہنچیں۔ گھر پہنچ کر تنویر نے شیریں کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اور سعیدہ اور وہ شیریں کے زخموں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

رات کے آخری حصے میں شیریں کو بخار ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس پر نیم بیہوشانہ کیفیت بھی طاری ہو گئی۔ سعیدہ اور تنویر دونوں نے جاگ کر رات کاٹی۔ صبح کے وقت مریضہ کی حالت خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر تنویر مضطرب ہو گیا۔ وہ سعیدہ کو شیریں کے پاس چھوڑ کر ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔ پانچ چھ منٹ کے بعد سعیدہ نے محسوس کیا کہ شیریں کے لبوں کو جنبش ہو رہی ہے وہ یہ سمجھی کہ مریضہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اسلئے اس نے اپنا چہرہ شیریں کے لبوں کے قریب لے جا کر اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ مریضہ کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر اس کے ہونٹوں سے ایک کمزور آواز یہ کہتے ہوئے نکل رہی تھی۔ "تنویر! میرے تنویر!! تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی، پیارے تنویر! تم بھی تو گر پڑے تھے!"

سعیدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اور اس کا چہرہ صبح کے بے نور، مضمحل اور افسردہ چاند کی مانند نظر آنے لگا۔ آہ وہ رنگین بستانیں، جن کے نشہ آلود آغوش میں اس کی زندگی ایک سپنا بن کر رہ گئی تھی۔ اب اس کے سامنے دو کمزور، مرجھائے ہوئے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان بیرحمانہ کچلی جا رہی تھیں، کئی لمحے وہ حیران اور گم سم —— خاموش کھڑی رہی۔ یکایک مریضہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھنے لگا۔ سعیدہ نے بعجلت اپنا ہاتھ اس کے سینے سے اٹھایا اور منہ موڑ کر دیوار پر روشندان کے سبز شیشے کے پرتو پر نگاہ جما دی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گویا زہر کے ذرے اس کے تمام جسم میں تحلیل ہو گئے، ہیں۔ مریضہ

نے زور سے سانس لیا۔ سعیدہ نے مڑ کر اس کے چہرے کو دیکھا پھر کھڑکی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اچانک قریب سے آواز آئی "ڈاکٹر آ رہے ہیں" یہ الفاظ کہنے والا تنویر تھا۔ سعیدہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور لحاف میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس دن وہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔ تنویر تنہا مریضہ کی خبر گیری کرتا رہا۔ شام کے وقت وہ سعیدہ کے کمرے میں آیا۔ اسوقت بدنصیب عورت ٹھوڑی کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے سعیدہ؟" تنویر نے بیوی کے اس رویے کے متعلق استفسار کیا۔

سعیدہ نے حسرت ناک نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ اور مضمحل آواز میں کہا "طبیعت ٹھیک نہیں!"

"بڑے افسوس کی بات ہے تمہیں اپنی طبیعت کی معمولی سی خرابی کا خیال پیدا ہو گیا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ ایک عزیز مہمان شدید بیماری کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔" تنویر نے خفگی سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں ...... میں سب کچھ کر لوں گا۔" یہ کہہ کر تنویر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں ...... درست ہے۔" سعیدہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں!

"تنویر رات بھر مریضہ کے پہلو میں بیٹھا رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیریں کی تیمارداری اس کی زندگی کا اہم ترین، محبوب ترین فرض ہے۔ پانچ چھ دن کے بعد سعیدہ بھی شیریں کی تیمارداری کرنے لگی۔ چند دن گزرنے پر شیریں کی صحت میں کافی اضافہ ہو گیا اور

وہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت بدلتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک ماہ کے بعد اسکی صحت بحال ہوگئی۔

(۵)

تنویر سو کر اٹھا ہی تھا۔ کہ اس کا خادم ایک لفافہ لئے ہوئے اندر آیا۔ تنویر نے پتے کی تحریر ہی سے پہچان لیا۔ کہ یہ شیریں کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ ایک مبہم سا خوف اسکے دل پر طاری ہوگیا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافے کو چاک کیا اور خط کو پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میرے تنویر!

تم متعجب ہوگے کہ میں تمہیں اطلاع دیئے بغیر کیوں جالندھر چلی آئی۔ واقعی یہ بات تعجب انگیز ہے۔ لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ کیوں مجبور تھی، اس کا جواب مندرجہ ذیل سطور دیں گی۔

"میرے تنویر! آج میں تمہارے سامنے اپنی زندگی کا وہ گوشہ بے نقاب کرتی ہوں جس سے تم بے خبر ہو۔ آہ! وہ زمانہ مجھے کبھی بھی نہیں بھولا۔ جب ہم بچے تھے، جب ہم بچوں کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ یہ زمانہ کتنا سہانا، کتنا دلآویز تھا۔ اس کا اندازہ ہم دونوں کے دل ہی لگا سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب پریم ساگر میں ہماری جیون نیا نے بہنا شروع کیا تھا۔ جب ہمارے لئے محبت کے حسین جلووں نے کائنات کے گوشے گوشے کو حسین بنا دیا تھا۔ تم میرے لئے بیتاب رہتے تھے اور میں تمہارے لئے بے چین! اس کے بعد نوجوانی کا زمانہ آیا۔ ہماری محبت میں زیادہ بیتابی پیدا ہوگئی۔ بچپن میں ہم ایک دوسرے کو اس لئے چاہتے تھے۔ کہ آپس میں کھیلیں، ایک دوسرے سے روٹھیں، ایک دوسرے کو منائیں مگر نوجوانی میں ہماری آرزو تھی۔ کہ

زندگی کے ہر شعبے میں، کائنات کے ہر گوشے میں، ایک دوسرے کے رفیق بنیں، ہماری یہ آرزو کوئی نرالی آرزو نہیں تھی۔ محبت کرنے والے دلوں کے ساز سے اسی آرزو کا نغمہ بلند ہوتا رہتا ہے۔ اس اثنا میں تم ولایت چلے گئے اور وہاں جا کر مجھ کو بھول گئے۔ گھر والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ تم نے ایک میم کو رفیقہ حیات بنا لیا ہے۔ میرے والدین نے میری شادی کر دی۔ مگر وہ زخم جو میرے دل پر لگا تھا کبھی بھی مندمل نہ ہو سکا۔ بظاہر میں تمہیں بھول گئی۔ مگر میرا دل کبھی بھی تمہیں نہ بھلا سکا۔ تم واپس آئے۔ جن لوگوں نے تمہارے متعلق افواہ اڑائی تھی، وہ شرمندہ ہوئے۔ مگر ان کے اظہارِ افسوس و شرمندگی سے کیا ہو سکتا تھا؛ دنیا کی رائے بدل گئی۔ مگر ہماری قسمت نہیں بدل سکتی تھی، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب واقعات ایک اور صورت اختیار کرتے ہیں۔ ولایت سے آنے کے بعد نہ تم نے مجھے بلایا اور نہ میں نے آنا چاہا۔ آخر میں آئی میں نے اپنے دل کو قابو میں رکھا اور تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی اس امر کا اندازہ نہ ہونے دیا کہ تم سے علیحدہ ہو کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ تم نے مجھے افسانہ سنایا، میں سب کچھ سمجھ گئی، تمہارے افسانے کے ایک ایک لفظ نے نشتر بن کر میرے زخم دروں کو چھیڑا۔ اس وقت بھی میں نے ضبط کیا۔ آہ! عورت بھی کیا عجیب ہستی ہے۔ اس کا دل زخموں سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں جاتی۔ خیر میں جالندھر چلی آئی۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری شادی پر خاص زور دیا تھا۔ تاکہ تم مجھے بھلا سکو۔ اس سے پیشتر تمہارا خط بھی آیا تھا۔ جس میں تم نے گزشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی محبت کا بیبانہ اظہار کیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ضبط کیا۔ تمہاری شادی ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد تقدیر واقعات کو عجیب پلٹا دیتی ہے۔ میرا رفیقِ زندگی دنیا سے سفر کر گیا۔ تم نے مجھے بلایا۔ میں تمہارے ہاں چلی گئی۔ پھر وہ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا۔ میں نے تمہیں سعیدہ سے چھین کر ایک۔ بہت

بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ محبت کرنے والے دل کی مصیبت کا اندازہ وہی دل لگا سکتا ہے جو خود محبت میں مبتلا ہو۔ میں سعیدہ کی مصیبت کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ اپنی محبت کی ناکامی کو دیکھ کر اس کے دل پر کتنے چرکے لگتے ہیں۔ آہ! میں نے اسے کئی بار آنسو بہاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کمزور فطرت عورت آنسو نہ بہائے تو اور کیا کرے؟ یہ دیکھ کر میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤں اور صرف ایک ہی چیز مجھے اس کے راستے سے ہٹا سکتی ہے اور وہ ہے موت! میں اپنے آپ کو موت کے سپرد کر رہی ہوں۔ تنویر مجھے معاف کر دو........ معاف کر دو۔ تم سعیدہ کے ہو اور سعیدہ تمہاری۔ خدا کی قسم سعیدہ ایسی نیک دل اور نیک سیرت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی وہ تمہیں بے تابانہ چاہتی ہے..... تمہاری پرستش کرتی ہے۔ تم بھی اسے چاہو۔ اپنا دل و جگر اس کے لئے وقف کر دو۔ خدا کرے تم ہمیشہ ہمیشہ مسرور زندگی بسر کرو۔ تمہیں اور سعیدہ کو میرا آخری سلام۔ اس وقت کہ آخری حروف لکھ رہی ہوں میری زندگی کے چند سانس رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی تمہارے لئے دعا کرتے ہوئے نکلیں گے۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا۔ میں دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں گی۔ الوداع!

شیریں

تنویر کے ہاتھ سے کاغذ گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دروازے کی طرف بھاگا...... مگر اس کا پاؤں ایک چھوٹے سے میز سے ٹکرا یا۔ اور وہ دھم سے گر پڑا آدھ گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک متلاطم سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ "شیریں نے حقیقت لکھی ہے؟...... یہ حقیقت ہو سکتی ہے؟" یہ سوال آتشیں حروف کی صورت میں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اس نے فرش پر ادھر

اُدھر نظر دوڑائی۔ مگر شیریں کا خط اسے نظر نہیں آتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اچانک میز پر اسے ایک لفافہ نظر آیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ اٹھایا۔ اسے کھولا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"میرے تنویر!

آج میں آخری بار تمھیں "میرے تنویر" سے خطاب کر رہی ہوں، میں نے انتہائی کوشش کی۔ کہ تم میرے بن کر رہو۔ مگر یہ میری قسمت میں نہیں تھا۔ شادی کے بعد، میں نے تمہیں غمگین ہی دیکھا۔ میں بہت سوچتی تھی، آخر تم غمگین کیوں ہو؟ آخر راز کھل گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم میرے نہیں بن سکتے۔ کیونکہ کسی اور کے بن چکے تھے۔ کاش! میں شیریں کی قسمت لے کر آتی۔

آج میں۔۔۔ جا رہی ہوں! کہاں؟۔۔۔۔۔ یہ میں خود بھی نہیں جانتی، مگر یہ جانتی ہوں۔ کہ تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہوں ________ خدا کرے۔ تم اور تمھاری شیریں دم واپسیں تک مسرور رہیں"

بدنصیب!

"سعیدہ"

تنویر کو، مکان گردش کرتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کا سانس رکا ہوا تھا۔۔۔ یکایک اس کی نظر انگیٹھی کے قریب شیریں کے خط پر پڑی۔ اس نے خط کو اٹھا لیا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں خطوں کو دیکھنے لگا۔

صبح کی کرنیں روشندانوں اور کھڑکیوں سے اندر داخل ہو رہی تھیں تنویر، ایک ہاتھ میں شیریں کا خط اور دوسرے ہاتھ میں سعیدہ کی تحریر پکڑے، انگیٹھی کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں آگ بجھ چکی تھی۔

بد نصیب
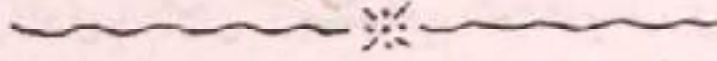
اکتوبر ۱۹۳۶ء

شیخ احمد اسمٰعیل کا اکلوتا لڑکا یوسف اسمٰعیل اپنے شاندار کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھا ہُوا، اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ ایک خادم آیا اور کہنے لگا "حضور! آپ سے ایک شخص ملنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے وُہ؟"

"اُس نے مجھے نام نہیں بتایا، کہتا ہے وُہ مجھے جانتے نہیں۔ اس لئے نام بتانا بیکار ہے۔"

"بلا لو۔"

خادم چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک کریہہ المنظر شخص دروازے میں سے جھانکا

"مسٹر یوسف آپ ہی ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں اندر تشریف لے آیئے۔"

وہ شخص اندر آگیا۔ اور جیب سے ایک سبز رنگ کا لفافہ نکال کر یوسف کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا:۔

"فیروز آپ کا خادم کل فوت ہو گیا ہے۔ یہ خط اس نے آپ کے نام بھیجا ہے۔"

"فیروز فوت ہو گیا ہے؟" یوسف نے قدرے غمگین لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، کل صبح اس نے دم دیا ہے۔ موت سے چند دن پیشتر اس نے یہ لفافہ مجھے دیا تھا۔ اور کہا تھا، جب میں مر جاؤں۔ تو یہ شیخ احمد اسمٰعیل کے لڑکے یوسف اسمٰعیل کو دے دینا۔"

یوسف نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں جیلخانے میں ملازم ہوں۔ مرحوم کے میرے ساتھ بڑے اچھے تعلقات تھے۔ بڑا نیک انسان تھا۔"

"بہت نیک انسان۔" یوسف نے اس کے الفاظ دُہرائے۔

"چند دن کے بعد اس کی قید کی میعاد پوری ہونے والی تھی، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

اس کے بعد اس شخص نے یوسف سے مرحوم کے متعلق دو چار اور باتیں کیں اور

چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یوسف نے لفافہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ عبارت کی سطریں ٹیڑھی ٹیڑھی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ دم تحریر لکھنے والے کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ تحریر یہ تھی:۔

میرے یوسف!

امید ہے تم مجھے بھولے نہیں ہو گے۔ اور میری تحریر پڑھ کر غالباً تم مجھے کبھی بھی نہیں بھولو گے۔ اس تحریر میں میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز، جو تمہاری زندگی کا بھی ایک بہت بڑا راز ہے منکشف کر رہا ہوں۔ یہ راز۔۔۔ اب تک راز بن کر ہی میرے دل میں رہتا۔ اور میرے مرنے کے ساتھ ہی میرے سینے میں دفن ہو جاتا، مگر ایک خاص ضرورت۔۔۔ ایک خاص وجہ مجھے مجبور کر رہی ہے۔ کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں میری

اچھے یوسف! اب میں اپنی زندگی کی دردانگیز داستان بیان کرتا ہوں:۔

"میں لاہور کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ والد مرحوم نے تجارت میں لاکھوں روپے کمائے تھے۔ اس لئے جب میں سن بلوغ کو پہنچا۔ تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث پایا۔ تنہا میں نے اس لئے کہا ہے۔ کیونکہ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دولت توقع سے بڑھ کر تھی" اور اس پر مستزاد یہ کہ سب میرے قبضے میں تھی۔ اس لئے میں نے زندگی عیش میں گزارنی شروع کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت بذاتِ خود دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر بعض اوقات انسان اسے اپنے لئے ایک ہولناک لعنت بنا لیتا ہے۔ مجھے دنیا کی یہ بہت بڑی نعمت ملی۔ مگر بدقسمتی سے میں نے اسے ہولناک لعنت بنا لیا۔ افسوس میں نے سمجھا کہ زندگی عبارت ہے عیش و عشرت سے مجموعہ ہے طرح طرح کی مسرتوں کا، اور

نام ہے حظائظِ نفسانیہ کے حصول کا۔ عیش پرست دوستوں نے اس خیال کو تقویت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی جائداد کو فضول خرچیوں کی نذر کرنا شروع کر دیا۔ میری بیوی جو ایک شریف اور دولتمند گھرانے کی چشم و چراغ تھی، مجھے ان تباہ کن فضول خرچیوں ـــــــ اللّے تللّوں اور ذلت خیز اطوار سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کرتی، مگر میرے یوسف! انسان جب ایک دفعہ گناہ آلود راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ تو بمشکل ہی اسے چھوڑتا ہے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود میں اندھا تھا۔ اپنی فضول خرچیوں میں مَیں نے ذرہ بھر کمی نہ کی، یہاں تک کہ دولت نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ اس وقت بھی مجھے ہوش نہ آیا۔ دولت بے وفائی کر چکی تھی، دوست منہ موڑ چکے تھے۔ رشتہ دار تمام تعلقات منقطع کر چکے تھے۔ مگر دنیا میں ابھی ایک ہستی تھی جو اب بھی میری تھی، جو اب بھی میری بربادیوں کو دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہا رہی تھی، جو اب بھی پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرتی تھی اور بجان و دل میری ہمدرد تھی، وہ ہستی میری بیوی تھی۔ عائشہ! آہ یہ محترم و مقدس نام لیتے ہوئے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے ـــــــ مگر میرے یوسف! دل ایک ایک حرف پر رُکے تو رُکے۔ مگر قلم نہیں رُکے گا۔ مجھے جو کچھ لکھنا ہے وہ ضرور لکھوں گا۔

میرے پاس دولت نہیں تھی۔ تاہم دل میں ہوس تو زندہ تھی۔ اس ہوس کو پورا کرنے کیلئے ذلیل و قابلِ نفرین ذرائع سے دولت حاصل کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا اور بہت جلد یہ خیال عملی صورت اختیار کر گیا۔ آہ! مجھے وہ رات ابھی تک نہیں بھولی جب میری بیکس بیوی اپنے ننھے سے بچے کو گود میں اٹھائے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر، مجھے بدی سے روکنے کے لئے آہ وزاری کر رہی تھی؛ میرا معصوم بچہ

بار بار میرا دامن پکڑ لیتا تھا۔ اس معصوم کو بھی شاید معلوم تھا کہ میں ذلیل مقصد کے لیے گھر سے نکل رہا ہوں۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ وہ حسرت انگیز منظر میری نظروں کے سامنے پھر رہا ہے افسوس اس وقت مجھے بدی اور گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔

—میں نے اپنا ناپاک ارادہ پورا کیا— ایک نہایت ذلیل ذریعے سے دولت حاصل کی—میں ذلت کی گہرائیوں میں پہنچ چکا تھا۔ پھر اپنی حالت کا خیال، نیکی کا احساس میرے ذہن میں کیونکر آ سکتا تھا۔ اپنی بیوی کی مسلسل گریہ آلود التجاؤں کے باوجود میں نے —اس ذلیل انسان نے ہزاروں ذلیل ارادے پورے کئے۔ نیکی کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں ہیں مگر بدی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ایک دن میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میرے ایک دوست نے آواز دی میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا۔

"چلو گے؟"—اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

اس "چلو گے" کا مطلب میں کیونکر نہ سمجھتا۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً تیار ہو گیا۔

"تمہارا بچہ کہاں ہے؟" اس نے خلافِ توقع پوچھا۔

"اندر ہے۔"

"ذرا لاؤ نا اُسے۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"بتاتا ہوں، تم لے آؤ۔ پھر چلیں گے۔"

میں تیزی کے ساتھ اندر گیا معصوم بچہ ڈیوڑھی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹولی پر سو رہا تھا ماں اندر کوئی کام کر رہی تھی، میں نے بچے کو اٹھایا اور باہر آ گیا۔ میرے دوست نے بچہ اپنی گود میں لے لیا اور چلنے لگا— "ایک زریں موقعہ ہاتھ آیا ہے۔" کچھ دیر چل کر میرے دوست

نے کہا۔

"کونسا موقعہ؟"

"ایک بہت بڑا رئیس ایک خوب صورت بچے کی تلاش میں ہے۔"

"کیوں؟" میں نے استفسار کیا۔

"کیونکہ رئیس کے ہاں اپنا کوئی بچہ نہیں۔ اور وہ کسی خولصورت بچے کو متبنیٰ بنانا چاہتا ہے۔ بچے کے لئے اس نے بہت بڑی رقم پیش کی ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ فی الحال اس ننھی جان کو رئیس کے حوالے کر دیں۔ اور اس سے رقم اینٹھ لیں —— چند دن بعد موقعہ پاکر اُسے لے آئیں۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا —؟"

میں نے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"خاموش ہو گئے، بھئی سچی بات یہ ہے۔ کہ آج کل ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ روپیہ پیدا کرنے کا نادر ترین ذریعہ ہے۔ بچے کا میں ذمہ دار ہوں، دس دن کے اندر اندر بچہ نہ لے آیا تو تم جو چاہو سزا دینا۔"

"لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے"

"چند دن کے اندر اندر بچہ لے آؤ گے؟"

"اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کبھی میں نے جھوٹا وعدہ بھی کیا ہے؟"

اتنے میں شراب کی دکان آگئی ہم دونوں اس کے اندر گھس گئے۔ شراب کی بوتلیں ہمارے سامنے آگئیں۔ اس ظالم انسان نے کچھ نقدی میرے ہاتھ میں دی۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا "مقصد پورا کر کے ابھی آیا" میں نے شراب کا گلاس منہ سے لگایا — اور —!

میرے یوسف! تم یہ سطور پڑھ کر مجھے لعنت و ملامت کر رہے ہو گے۔ خوب کرو — مگر میں ابھی کچھ نہیں کہتا۔ تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

جب میرا جہاز اُترا تو وہاں نہ میرا دوست تھا اور نہ میرا بچہ۔ تمام نقدی بھی ختم ہو چکی تھی، میں فوراً دوست کے گھر پہنچا۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ میں بہت سٹپٹایا۔ ایک شناسا وہاں مل گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شیطان یہ گھر چھوڑ چکا ہے۔ اور اب معلوم نہیں کہاں ہے۔ میں اسے تلاش کرتا رہا، مگر بے سود۔ آخر میں گھر کی طرف چلا۔ ابھی دروازے پر ہی پہنچا تھا۔ کہ پولیس کے سپاہیوں نے ایک چوری کے الزام میں جو میں نے دو مہینے پیشتر کی تھی، گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد میں جیل خانے میں تھا۔

جب میری بیوی کو اس واقعے کی خبر ملی۔ تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں، ہنچکے ہوئے رخساروں پر جا بجا آنسوؤں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس نے صرف چند الفاظ کہے۔ مگر یہ چند الفاظ نشتر بن کر میرے دل میں چبھ گئے۔ آہ! اس وقت اس کی حالت کتنی قابلِ رحم تھی۔ جب وہ حدتِ آفتاب سے تپتی ہوئی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اپنا مغموم و غمناک چہرہ ایک سلاخ سے لگائے دھوپ میں کھڑی ہوئی رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر نہایت درد انگیز لہجے میں کہہ رہی تھی، "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

یہ الفاظ سُنتے ہی میرا سینہ پھٹ گیا۔ میں نے چاہا کہ اسے تسلی دوں، اسے کہوں، تمہارا بیٹا صحیح سلامت موجود ہے۔ مگر میری زبان رُک گئی۔ اس نے یہ نشتر بدامن الفاظ دُہرائے۔ میں پھر خاموش رہا۔ اپنی تمنا اپنی آرزو کے خلاف خاموش رہا۔

وہ چلی گئی۔ اس کے الفاظ آتشین شعلے بن کر میرے دل کو جلانے لگے۔ روح کی

گہرائیوں میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اور اپنے گزشتہ مظالم ایک ایک کر کے مجھے یاد آنے لگے —— یاد آ آ کر تڑپانے لگے۔ میری طبیعت سخت بے قرار رہنے لگی۔ رات کو جب میں لیٹتا تو سوتے میں وہ بدنصیب عورت مجھ سے اپنا بیٹا مانگتی۔ میں چیخ مار کر —— گھبرا کر بیدار ہو جاتا۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا۔ مگر میرا ہاتھ ظالم سیاہ خون کو چھو کر رہ جاتا۔ بھیانک تاریکی میں کوئی صورت دکھائی نہ دیتی۔ خوفناک خاموشی میں کوئی آواز کان میں نہ آتی۔ اس ذہنی کوفت، دماغی بے قراری اور روحانی اذیت نے میرا بُرا حال کر دیا۔ چند دن کے بعد میری بیوی پھر آئی۔ بدقسمت عورت نے آتے ہی وہی الفاظ کہے۔ جنہوں نے میری زندگی کا چین اور آرام چھین لیا تھا۔ اس وقت میں بے اختیار ہو کر چاہتا تھا کہ اسے تمام واقعہ سنا دوں، میں واقعہ سنانے لگا۔ وہ چپ چاپ ایک زخمی پرندے کی طرح جو بیرحم شکاری کے پھندے میں پھنس کر حسرت اندوز نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے، مجھے دیکھتی رہی —— میں اس کا شکاری، اس کے معصوم بچے کا شکاری بولتا رہا یہاں تک کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بدنصیب عورت کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کی آخری رحم طلب نگاہیں تیر بن کر میرے دل پر آ لگیں۔

مجھے اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ میرا بیٹا زندہ ہے یا مردہ —— اب بدنصیب ماں سے زیادہ بدنصیب باپ اپنے بیٹے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ جب قید کی میعاد پوری ہو گئی۔ تو میں نے قسم کھائی۔ کہ سب سے پہلے اپنے بیٹے کی تلاش کروں گا۔ اور اس مقصد کے حصول میں اگر جان بھی چلی جائے تو دریغ نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے گھر کی طرف قدم اٹھائے اور یہ دیکھ کر میں سخت حیران ہو گیا کہ میرے ٹوٹے پھوٹے مکان کی بجائے ایک عالیشان مکان کھڑا ہے۔ ہمسایوں نے مجھے بتایا کہ یہ مکان ایک سیٹھ کا ہے جس کا میں قرضدار

تھا۔ قرضے میں اس نے میرا مکان قرق کروا لیا تھا۔ اور میری بیوی ——— ؟ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

میں شہر میں گھومنے لگا ——— میرے پیشِ نظر دو مقصد تھے، ایک تو اپنی بد نصیب بیوی کی تلاش۔ اور دوسرے اپنے بیٹے کو دیکھنا ——— ان مقاصد کے لئے میں نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ ملا۔ آخر میں تمہارے شہر میں آیا۔ تھک کر ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ مجھے اپنے قریب ہی اپنا بیٹا ——— اپنا یوسف نظر آیا۔"

یوسف کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔" اپنا بیٹا یوسف" اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے زمین گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اتنے بڑے رئیس کا متبنےٰ اور ——— معمولی سے ملازم کا بیٹا ——— کتنا تعجب انگیز واقعہ ؟؟

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا :۔

" یہ الفاظ پڑھ کر تمہیں بڑی حیرت ہوئی ہو گی۔ مجھے اس کا سخت افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ایک نہایت تلخ حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔ مگر کیا کروں میرے بیٹے ! افشائے راز پر مجبور ہوں۔

" خیر ! میرا ایک مقصد تو پورا ہو گیا تھا ——— میرا بیٹا تو مجھے نظر آ گیا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ جس رئیس نے تمہیں متبنےٰ بنایا ہوا ہے۔ اس کے ہاں نوکری کر لوں۔ اس طرح تمہارے پاس بھی رہوں گا اور اپنی بیوی ——— تمہاری ماں کو بھی ڈھونڈتا رہوں گا۔ دوسرے دن میں شیخ احمد اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا اور نوکری کے لئے درخواست کی۔ انہوں نے مجھے تمہاری خدمت کے لئے نوکر رکھ لیا۔ حقیقی باپ اپنے بیٹے کا نوکر مقرر ہوا۔

یوسف کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرنے لگے۔

" اب میرے سپرد دو کام تھے، ایک تمہاری خدمت اور دوسرا تمہاری ماں کی تلاش ہر روز وقت ملنے پر میں اِدھر اُدھر پھرتا۔ لوگوں سے پتہ پوچھتا ـــــ الغرض تمہاری ماں کی تلاش میں انتہائی کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ نصیب کا بنات کے کس گوشے میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

میرے بیٹے! میں نے تمہاری ماں کی تلاش جاری رکھی۔ آٹھ سال تک میں اسی کوشش میں سرگرداں رہا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ مل گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اور جالندھر کے ایک محلہ چاہ لالے والا میں رہتی ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچا۔ آہ دکھیاری عورت کو غموں نے بہت جلد بوڑھا کر دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا۔ وہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا اور کہا:۔

" عائشہ! تمہارا بیٹا مل گیا ہے۔ وہ تم سے ملنے آئے گا۔"

" تم ـــــ!" اس نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر کہا

" میرا بیٹا آئے گا! کب؟"

" ابھی تم سے ملنے آئے گا۔ اب تو وہ بہت امیر ہے۔"

" میرا بیٹا! اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ فرطِ ضعف سے اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ اس کی افسردہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ جلد میرے بیٹے کو لاؤ ـــــ اس کے بعد میں واپس آ گیا۔

یوسف کا دل دھڑکنے لگا۔

میں نے تمہیں کہا۔ جالندھر میں میرے ایک رشتہ دار کی شادی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو، میرے اچھے یوسف! تم چلنے پر تیار ہو گئے۔ اس وقت میرا دل بے اختیار چاہتا

تھا کہ ہم دونوں پر لگا کر تمہاری ماں کے پاس پہنچ جائیں۔

"جب ہم ٹرین میں بیٹھے تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ہم محلہ چپاہ لانے والا میں داخل ہوئے۔ ایک شخص کفن ہاتھ میں لئے ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ میرے دل پر ایک چرکہ سا لگا۔ آگے بڑھے تو دیکھا ایک شخص تھال ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے پیسے مانگ رہا ہے۔ اس نے تھال ہمارے آگے بھی بڑھایا اور کہا۔

"ایک غریب عورت فوت ہو گئی ہے۔ تجہیز و تکفین میں آپ بھی مدد کریں"۔

"کون غریب عورت؟" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"اُس مکان میں رہتی تھی بے چاری ـــ" اس شخص نے اسی مکان کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں میں نے تمہاری ماں کو دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا سینہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ میرے یوسف! میرے بیٹے! تجھ سے میری اپنی ہوئی۔ تمہاری ماں کے جنازے کے لئے کچھ خیرات مانگی جا رہی تھی"۔

یوسف کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کاغذ پر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور ٹھنڈی آہ بھری!

"میں نے تمہیں وہیں ٹھہرایا اور مرحومہ کے پاس پہنچا۔ تمہاری ماں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گویا وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اس وقت مجھے ضبط کرنا محال تھا ـــ تم باہر کھڑے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس اندوہناک واقعے کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ؟ ـــ میں نے دل میں کہا۔ بڑی کوشش سے میں نے آنسو روکے۔ باہر آیا اور تمہیں یہ کہکر واپس بھیج دیا کہ میری ایک دور کی رشتہ دار فوت ہو گئی ہے۔ تم چلے گئے ـــ پھر میں بدنصیب عورت کی نعش سے لپٹ کر خوب

رو دیا۔ اور معلوم نہیں میری یہ حالت کب تک رہتی مگر لوگوں نے مجھے علیحدہ کر دیا۔

میرے یوسف آٹھ سال تک میں تمہارے ہاں رہا تھا۔ پندرہ روپے مجھے تنخواہ کے طور پر ملتے تھے۔ جن میں سے میں زیادہ سے زیادہ دو تین خرچ کرتا تھا۔ باقی جمع کرتا تھا۔ تاکہ جب تمہاری ماں مل جائے تو اسے دیدوں۔ اُس وقت تمام جمع شدہ رقم میرے جیب میں تھی۔ میں نے اس میں سے کچھ مرحومہ کے تجہیز و تکفین پر خرچ کی اور باقی روپے میری جیب میں رہے ——— میری بدنصیبی کی انتہا ہو چکی تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا کہ ایک دفعہ تم سے مل لوں اور پھر کہیں دُور چلا جاؤں۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا تو تمہارے نوکروں نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہارے ہاں میری عدم موجودگی میں جو چوری ہوئی تھی۔ اس کا مرتکب مجھ بدنصیب کو سمجھا گیا تھا۔ ستم پر ستم یہ کہ میری نقدی نے ان کے شبہ کو یقین کی صورت دے دی ——— میرے بیٹے! جب تم نے میرے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیکھا ——— تو تمہیں بہت افسوس ہوا تمہیں کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ میں چور ہوں۔ میرے پیارے بیٹے! اب حقیقت تم پر ظاہر ہو گئی ہے۔ میں جیل پہنچا دیا گیا۔ اب میری زندگی کی داستان ختم ہو گئی ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ بتا دیا۔ شاید میں دو تین دن اور زندہ رہوں ایک آرزو ہے۔ میرے بیٹے! اپنے باپ کی بدنصیبی پر افسوس نہ کرو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب جبکہ میں موت کے کنارے پہنچ چکا ہوں، میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری ماں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میرے لختِ جگر تم بھی مجھے معاف کر دو ——— اپنے بدنصیب باپ کو معاف کر دو دعا کرو خدا بھی مجھے معاف کر دے۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ اچھا بیٹا! اب الوداع

تمہارا بدنصیب باپ — فیروز

سوکھی ہوئی ندی

اگست ۱۹۳۹ء

آندھی ختم ہو چکی تھی۔ مگر ابھی کہیں کہیں گرد و غبار کے بادل سورج کی الوداعی زرد زرد روشنی میں منڈلا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور وہ دونوں سوکھی ہوئی ندی کے کنارے ایک دوسرے کے بالکل قریب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گویا کسی گہری فکر میں غرق ہیں۔ اچانک ان کے سروں کے اوپر ایک چیل کی دردناک آواز گونجی۔ اس پر ایک نے سر اٹھایا۔ اور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے پروں کو دیکھنے لگا۔ دو تین لمحوں کے بعد چیل افق کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ اس پر اس نے اپنی سیاہ ٹوپی زانو سے اٹھا کر چھڑی کے قریب رکھ دی اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ " پار سال یہ نہر پانی سے لبالب بھری

ہوئی تھی، مگر اب تو کہیں ایک قطرۂ آب بھی نظر نہیں آتا۔"

دوسرے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں ایک بڑ کے درخت کے نیچے چند خانہ بدوشوں کے درمیان آگ کے مدھم سے شعلوں پر جمی تھیں۔ پہلا چند لمحے اپنے ساتھی کا جائزہ لیتا رہا، پھر بولا۔ "تم کئی بار میرے ساتھ یہاں آئے تھے سلطان!"

سلطان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "پار سال بہت بارش ہوئی اور اس میں اس قدر پانی جمع ہو گیا۔ کہ لوگ نہایا کرتے تھے لیکن آج یہاں خاک اڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کبھی پانی تھا ہی نہیں ۔۔۔ زندگی میں بھی ۔۔۔" سلطان کہتے کہتے رک گیا۔

"زندگی میں بھی ۔۔۔ کیا؟"

"کچھ نہیں ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کونسا خیال ۔۔۔ بتلاتے کیوں نہیں؟"

"کوئی خاص خیال نہیں" ۔۔۔ یہ کہہ کر سلطان اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی چھڑی پر پھیرنے لگا۔

"اگر کوئی خاص خیال نہیں تو پھر بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس سوکھی ہوئی ندی کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے ۔۔۔ ایک ایسا واقعہ جس نے میری رگ رگ میں طوفانِ کیف و نشاط برپا کر دیا تھا ۔۔۔ ایک ایسا واقعہ جس نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرت سے روشناس کرایا تھا۔"

"اور آج ۔۔۔؟"

"اور آج میں پھر پہلا سا افسردہ روح، اور پژمردہ دل انسان ہوں۔"

"تم پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہو سلطان!"

"اگر تم مُصر ہی ہو تو میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ بچپن ہی میں میرے دل و دماغ پر قنوطیت چھائی ہوئی تھی۔ اور میں زندگی کے اس زرّیں دور میں بھی افسردہ رہتا تھا۔ کتابوں کے علاوہ مجھے کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ دن کے وقت گھر کے آخری کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کتابیں پڑھتا رہتا۔ اور رات کو اپنی دادی اماں سے بادشاہوں اور راجاؤں کے قصے سنتا سنتا سو جاتا۔ ٹریجڈی مجھے بہت پسند تھی اور جب کبھی میں کسی کتاب میں کوئی حسرت انجام قصہ پڑھتا۔ تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں اور میں بعض اوقات اتنا روتا کہ کتاب کے ورق گیلے ہو جاتے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے مجھے کئی بار شرمندگی اٹھانا پڑی۔ لیکن جب سیلِ اشک آنکھوں میں اُمنڈ آتا تھا، تو سوائے رونے کے اور کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔ میری عزلت نشینی محلہ بھر میں مشہور تھی۔ اور جب میں گھر سے باہر نکلتا تو لوگ مجھے اس طرح دیکھتے کوئی عجیب چیز دیکھ رہے ہیں۔ میں لوگوں کے طنزیہ فقرے سنتا اور خاموش رہتا — اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

میرے والد صاحب بڑی غضبناک طبیعت کے مالک تھے۔ آخر عمر میں وہ نورِ بصارت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اور اس چیز نے ان کی فطری زود رنجی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ میری والدہ بڑی مسکین طبیعت کی عورت تھیں اور کسی سے بولنا چالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ بھائی بھی عموماً خاموش طبع تھے۔ اسی ماحول میں میری افسردہ زندگی گزر رہی تھی

اس وقت میری عمر شاید اکیس سال کی تھی۔ جب ہم نے مکان تبدیل کیا ہمارے مکان کے سامنے ایک ٹھیکیدار صاحب رہتے تھے۔ جو بہت نیکدل انسان تھے۔ چنانچہ جلد ہی اُن کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہو گئے۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ کہ مجھے ٹھیکیدار صاحب کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک گورا گورا ہاتھ باہر نکلتا ہوا

دکھائی دیا۔ میں اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد، دو موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں دکھائی دیں
یہ خوبصورت آنکھیں گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی تھیں اور ان کے دیکھنے میں مجھے خاص لطف حاصل
ہوا۔ دوسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ نہ صرف دوسرے دن بلکہ کئی دن تک یہی ہوتا رہا۔
اب تو ہر وقت وہی سیاہ موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں میری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر رہتیں
اور میں بڑی بے قراری کے ساتھ صبح کا انتظار کرتا رہتا۔

" ایک دن ٹھیکیدار صاحب کے یہاں دعوت تھی۔ میں ان کے یہاں اسوقت پہنچا جب
تمام لوگ کھا پی کر رخصت ہو چکے تھے۔ خالہ جی (میں ٹھیکیدار صاحب کی بیوی کو خالہ جی کہا کرتا
تھا) نے میرے سامنے کھانا چُن دیا۔ اور آپ کسی کام کے لئے اوپر چلی گئیں۔ میں نے دو تین
نوالے ہی لئے ہوں گے۔ کہ قریب سے ایک نہایت میٹھی آواز آئی :-

" اتنی جلدی جلدی تو نہ کھایئے ؟"

میں نے سامنے دیکھا۔ دروازے پر وُہی سیاہ موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی
لڑکی کھڑی مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جواب دوں مگر
کیا جواب دوں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

" آپ اتنی دیر سے کیوں آئے بھلا ؟" اس نے پوچھا۔

" ایک ضروری کام تھا۔"

" اوہ! ضروری کام ـــ بھلا آپ کو ہماری کیا پروا پڑی ہے۔"

" نہیں، یہ بات نہیں ـــ یہ بات کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔"

" آپ کا نام سُلطان ہے نا ؟"

" جی ہاں ـــ اور آپ کو شاید "زہرا" کہتے ہیں۔"

"اوہو۔ آپ میرا نام بھی جانتے ہیں۔ خیر سُنا ہے آپ بڑے لائق فائق ہیں۔ افسانہ نویس ہیں اور ڈرامانگار بھی۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں۔"

"یہ تو آپ کی غلط فہمی ہے ۔ آپ بہت کچھ ہیں۔"

"شکریہ ۔ بہت بہت۔"

"آپ گھبرا کیوں رہے ہیں؟ پانی منگواؤں کیا؟"

"مجھے پیاس تو نہیں لگی۔"

اتنے میں دالان کے ایک گوشے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ زہرا اندر چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں گھر چلا آیا۔ وہ رات بڑی بے قراری کے عالم میں کٹی۔ اس واقعے کے چند دن بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کہ مجھے محسوس ہوا دروازے پر کوئی کھڑا ہے۔ میں نے کرسی سے اٹھ کر دیکھا۔ زہرا دروازے پر کھڑی تھی۔

"اندر آنے کی اجازت ہے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں آجائیے!" میں نے کہا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔

"آپ بڑے ستم ظریف آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔" اس نے اندر آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔"

"آپ ستم ظریف نہیں تو اور کیا ہیں۔ دنیا سے قطع تعلق کر کے ہر وقت پڑھتے رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔"

"یہ میری عادت ہے۔"

"عادت ہے؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"آپ ہنس کیوں رہی ہیں — ؟"

"یونہی — بغیر کسی وجہ کے — اور ہاں میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے روزانہ آدھ گھنٹہ پڑھا دیا کریں گے؟"

"آپ تو خود لائق ہیں — !"

"یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا — سوچیے نا! اگر میں لائق ہوتی۔ تو آپ کو کیوں تکلیف دیتی — !"

"میں حاضر ہوں مگر — !"

"میں اباجان اور امی جی کو راضی کر لونگی — آپ تو تیار ہیں؟"

"مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے!"

دو تین منٹ بیٹھی اور پھر چلی گئی۔

"میں زہرا کو پڑھانے لگا — اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا۔ مجھے کائنات کی ہر چیز نوجوان، حسین اور رنگین نظر آنے لگی۔ زہرا جب ہنس ہنس کر باتیں کرتی، تو مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ایک سہانا راگ بن گئی ہے — دُنیا رنگ و نکہت کے طوفان میں بہ رہی ہے۔

ایک سال تک میں مسرت و نشاط میں ڈوبا رہا۔

ایک دن جب میں دفتر سے آیا تو میں نے ایک ایسی خبر سنی۔ جس نے میرے دل و دماغ میں آگ سی لگا دی۔ میں نے سُنا کہ زہرا کا نکاح ہو گیا ہے۔ اس دن بھی میں زہرا کو نہ دیکھ سکا۔ دوسرے دن اس کے گھر گیا۔ مگر وہ کہیں اوپر تھی۔ تیسرے دن میں نے اس کی طرف ایک

رقعہ بھیجا جواب میں اس نے بھی رقعہ بھیجا۔ جس میں لکھا تھا :۔

سلطان صاحب :

"پچھلی باتوں کو بھلا دیجئے۔ میرا آپ کا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب ہمیں علیحدہ علیحدہ راستوں پر سفر کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ ہمیشہ خوش رہیں گے۔

"زُہرا"

میرے دل کی آگ اور بھڑک اُٹھی"۔ میں نے انتہائی کوشش کی۔ کہ چند منٹ کے لئے زہرا سے گفتگو کروں۔ مگر ناکام ہی رہا۔

چند ماہ کے بعد زہرا کی شادی ہوگئی اور وُہ کراچی چلی گئی ——— اس کے بعد میں پھر وُہی افسردہ دل اور مضمحل دماغ انسان ہوں ——— زہرا نے مجھ سے میری تمام مسرتیں چھین لی ہیں۔ یہ ہے میری داستان"!

یہ کہہ کر سلطان سوکھی ہوئی ندی کو دیکھنے لگا۔

" اس کے بعد زہرا کو تو نہیں دیکھا۔"

" نہیں ——— میری زندگی کی سوکھی ہوئی ندی میں صرف ایک بار پانی آیا ——— اسقدر پانی آیا۔ کہ یہ لبالب بھر گئی ——— مگر اب پھر اس سوکھی ہوئی ندی کی مانند ایک قطرۂ آب سے بھی محروم ہے۔"

سلطان کا ساتھی چند لمحے سُوکھی ہوئی ندی کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا :۔

" اگر یہ ندی بارش کی محتاج ہونے کے بجائے دریا سے پانی حاصل کرتی۔ تو آج اس کا یہ حال نہ ہوتا۔"

سلطان استفسار انگیز نگاہوں سے اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا۔ تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی

بیکسی

نومبر ۱۹۳۶ء

جاڑے کی سرد، تاریک اور طویل رات، ابتدائی منزل طے کر رہی تھی۔ سردی پورے
شباب پر تھی، ہوا کے سرد، جسم خراش جھونکے، انتہائی تیزی و تندی کے ساتھ چل رہے تھے۔ شہر
کے وسط میں شاندار، بلند اور خوشنما مکانات کی ایک مسلسل قطار کی ایک طرف، ایک یک منزلہ
اور شکستہ مکان میں، جس کی در و دیوار پر جا بجا شگاف نظر آ رہے تھے، غریب و مفلس
بد نصیب و بدحال مزدور کریم، زمین کے اوپر، ایک میلے کچیلے تکیئے پر سر رکھے، لیٹا ہوا تھا۔
اس کی دائیں طرف چند قدموں کے فاصلے پر، اس کی فاقوں سے نڈھال بیوی مریم، کچھ
ڈھونڈ رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی کے اوپر ان کا لختِ جگر،

شدتِ تپ سے تڑپ رہا تھا۔ کمرے کا تمام سامان، ایک چارپائی، جس کی تمام رسیاں زمین بوس ہو رہی تھیں، پانی سے بھرے ہوئے ایک گھڑے اور چند برتنوں پر مشتمل تھا۔ بچے کے ایک طرف محفوظ جگہ پر مٹی کا دیا مدھم روشنی دے رہا تھا۔ مریم نے روٹی کے چند سوکھے ہوئے ٹکڑے نکالے اور انہیں پانی سے لبریز پیالے میں ڈال دیا۔ کریم کو شدت سے کھانسی آئی۔ مریم نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

"تمہیں آج بار بار کھانسی کیوں آ رہی ہے؟"

"کیا کہوں....... کھانسی..... تو دم لینے نہیں دیتی!"

"غریبوں کے لئے دنیا میں دکھ ہی دکھ ہیں۔" مریم نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ غریب پیدا ہی دکھوں......... کے لئے ہوئے ہیں۔ کریم نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تھوڑا سا پانی پی لو —" یہ کہتے ہوئے مریم نے ایک برتن میں اسے پانی دیا۔

"اس سے کیا ہوگا؟"......

"شیرو کی حالت آج بہت خراب ہے؟"

اس کے جواب میں کریم نے آہ بھری اور پانی پی لیا۔

"اماں"! بچے نے کمزور آواز میں کہا۔

"کیوں میرے لال"؟ مریم تیزی سے اس کے پاس پہنچتے ہوئے بولی۔

"سردی!"

"تجھے سردی لگ رہی ہے؟" بیکس عورت نے آہ بھری — آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ "میں تجھے چھاتی سے لگا لیتی ہوں۔ اب تجھے سردی نہیں لگے گی شیرو!"

"کیا حال ہے اس کا ؟" کریم نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"بدن تپ رہا ہے۔ گھر میں کوئی کپڑا نہیں ہے!"

"اور ہمیں کیا حاصل ہے ؟" دو دن سے پیٹ میں ایک دانہ تک نہیں گیا۔"

"آخر خانصاحب تنخواہ کیوں نہیں دیتے ؟"

"وہ دولتمند آدمی ہیں ..... انہیں سب کچھ حاصل ہے ...... انہیں ہماری حالت کی کیا خبر ؟ .... آہ .... "کھانسی کے حملے نے اسے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا

"یہ دولت مند آدمی کتنے ظالم ہوتے ہیں ؟"

"ظالم ! .... بہت ظالم ...... !! میں نے دو سال خانصاحب کی خدمت کی ..... رات دن ان کا ...... حکم مانتا رہا ...... مگر ...... ایک دن ...... اپنے ..... بیمار بچے ...... کو چھوڑ کر ان کا حکم نہ مان سکا۔ یہی میرا قصور تھا ...... اور اسی قصور پہ .... انہوں نے ......" وہ کھانسنے لگا۔ پھر ایک منٹ کے بعد، سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا" اسی قصور پر انہوں نے مجھے نکال دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ .... میری تنخواہ بھی ... ضبط کر لی ..... یہ کتنا بڑا ظلم ہے ......"

"امیر آدمیوں کو خدا نے شاید اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ غریبوں پہ ظلم کریں" بیوی نے ظالم خاوند کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"امیر آدمی سمجھتے ہیں۔ کہ شاید غریبوں کا پیٹ کھانے کو نہیں ...... مانگتا" اب اسکی آواز میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔

"وہ سمجھتے ہیں ... کہ شاید غریبوں کو کپڑوں کی ...... ضرورت نہیں ہے آخر غریب انسان کہاں جائیں ؟"

"اور ہم اس سے قرض کب مانگتے ہیں۔ ایک مہینہ اس کا کام نہیں کیا؟"

"اگر خانصاحب تنخواہ دے دیتا۔ تو میں شیرو کے واسطے ایک چھوڑ دو لحاف لے آتا اسے ڈاکٹر.......کے پاس بھی لے جاتا....... مگر اب تو گھر میں......کھانے کے واسطے ......بھی نہیں ہے.... خانصاحب کو.......میرے رونے پر بھی رحم نہ آیا......"

"تم وہاں جاکر کیوں روئے تھے؟"

"کیا کرتا؟ مگر رونے سے کیا بنا؟"

"کتنا بے رحم آدمی ہے!"

"امیر بے رحم ہی ہوتے ہیں مریم!........ اوہ! میری چھاتی میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

"ادھر شیرو سردی سے کانپ رہا ہے۔ آخر کیا ہوگا؟"

"اس کے منہ میں کچھ ڈالا۔" کریم نے پوچھا۔

"کیا ڈالوں...... ہاں!" مریم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر رہے تھے۔ اس نے پیالے میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا۔ اور معصوم بچے کے منہ میں ڈال دیا۔

"یہ ہڈی........ ہے۔" بچے نے ٹکڑا منہ سے نکال کر کہا۔

"نہیں بیٹا، روٹی ہے.... کھالونا......" اس نے ٹکڑا دوبارہ اس کے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ شیرو نے منہ ہٹا لیا۔

"نہیں کھاتا" مریم نے خاوند کو مخاطب کرکے کہا۔

"کھالے میرے شیرو! صبح تجھے مٹھائی بھی لاکر دوں گا۔"

"کہتا ہے یہ ہڈی ہے......"

"اس کے ماں باپ کو...... تو دو دن سے...... یہ ہڈیاں بھی...... کھانے کو نہیں ملیں...... آہ"! وہ ذرا ٹھہرا...... "تم کھا لو...... ! دو دن سے بھوکی ہو مریم"

"اور تمہارا بھی یہی حال ہے" مریم نے جواب دیا۔

"میری بات چھوڑو......"

"اگر خانصاحب تنخواہ دے دیتا۔ تو ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔" مریم نے پیالہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیوں بار بار اس کا نام...... لے رہی ہے...... وہ ہمیں کچھ نہیں دے گا۔ ...... ہم ننگے بھوکے آدمی...... فاقوں ہی سے مریں گے!" کھانسی کی شدت نے اس کا دم روک دیا۔

مریم نے اپنے خاوند کی جانب گھور کر دیکھا۔ چند منٹ تک بچے کی ہائے ہائے، اور کریم کی کھانسی کی آواز کے سوا وہاں اور کوئی آواز نہ پیدا ہوئی۔

"شیرو کی حالت بہت خراب ہے ___!" مریم نے بچے کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس لاؤ اسے!"

مریم نے بچے کو خاوند کی گود میں لٹا دیا۔

"آہ! کتنا بخار ہے...... یہ ننھی سی جان بھی ہمارے ساتھ...... دکھ اٹھا رہی ہے......"

"اگر ہماری قسمت میں اتنے دکھ تھے۔ تو خدا نے ہمیں پیدا ہی کیوں کیا؟" یہ کہہ کر مریم کریم کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ تینوں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ ہوا کے تیز و سرد جھونکے زیر و با

کی طرح ان کے جسموں کو لگ رہے تھے۔ کریم نے کھانسا اور منہ موڑ کر تھوکا۔

"تھوک کے ساتھ خون تو نہیں آ رہا..... مریم! ..... ذرا دیا لانا!"

مریم اُٹھی، دیا لائی، بڑی احتیاط سے دونوں ہاتھ چراغ کے مدھم شعلے کے گرد رکھے۔

کریم کے پاس خون جما ہوا تھا۔ مریم پھٹی پھٹی نظروں سے خون دیکھنے لگی۔ ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا آیا اور دیا بجھ گیا۔

"دیا بجھ گیا اور گھر میں ..... دیا سلائی بھی نہیں ہوگی؟"

"نہیں" مریم نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بھی ہونا تھا..." اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"شبیرو! شبیرو!!" یکایک مریم نے گھبرا کر کہا۔

"کیا ہے؟" کریم نے اپنا ہاتھ ٹٹولتے ہوئے اس کی پیشانی پر رکھا۔ "اس کا بدن کیوں سرد ہو گیا ہے؟" دونوں کے کانپتے ہوئے ہاتھ بچے کے جسم کو چھو رہے تھے۔

"یہاں تو یہ مر جائے گا — اور معلوم نہیں ہمارا کیا حال ہو۔ خانصاحب کے مکان میں چلیں۔ ایک رات وہ ہمیں اپنے مکان میں رہنے دے گا۔ اور ہماری حالت دیکھ کر تنخواہ بھی دے دیگا۔" مریم نے کہا۔

"خانصاحب کے مکان کو چلیں ..... ؟ اچھا اُٹھو!"

دونوں اٹھے اور گھر سے باہر نکل آئے۔ مریم نے بچے کو سینے سے چمٹایا ہوا تھا کریم آگے آگے جا رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاند کی مدھم روشنی میں وہ چل رہے تھے۔

(۲)

ادھر ادھر کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ عالیشان مکانوں کے رنگین شیشوں میں سے، روشنی نکل نکل کر باہر گر رہی تھی، کھڑکیوں میں سے بلند قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھی، مخلوق خدا، راحت و آرام میں غرق تھی، یہ بد نصیب و مظلوم ہستیاں سرد جھونکوں کے جسم کش حملے برداشت کرتی، ٹھوکریں کھاتی، گرتی پڑتی چلی جا رہی تھیں، غریب کریم کو بار بار کھانسی آ رہی تھی اور وہ بار بار ٹھہر جاتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اور دوسرا بچے کے سر پر پھیر رہا تھا۔ بیچاری ماں نے اپنے لخت جگر کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ آہ! اس وقت ان بیکسوں کی حالت کس قدر قابل رحم تھی، ایک وسیع بلند اور خوبصورت مکان کے آگے یہ بیچارے رُک گئے۔

"تم یہیں ٹھہرو ...... میں دروازہ ...... کھٹکھٹاتا ہوں ......" یہ کہہ کر کریم نے اپنی بیوی کو دروازے کے پاس ٹھہرایا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ..... مسلسل کھٹکھٹانے سے خانصاحب کے منشی نے دروازہ کھولا۔ کریم کی شکل دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حقارت و خشونت کے آثار پیدا ہو گئے۔

"تم رات کو بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔" منشی نے سخت لہجے میں کہا۔

"اس دروازے کو چھوڑ کر، ہم کہاں جائیں ...... دیکھو ہماری حالت کیا ہے؟ بچہ بیمار ہے ...... مجھے کھانسی آ رہی ہے ...... میری بیوی ......!"

"مگر اس وقت تو خانصاحب مکان پر نہیں ہیں۔ ذرا ٹھہر کر آنا۔" منشی نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو ہمیں کسی کمرے میں بیٹھنے دیں۔ ...... باہر سردی میں مر جا ئیں گے۔"

"خانصاحب کے حکم کے بغیر میں یہ کیونکر کر سکتا ہوں ...... ؟ میں نے جو کہا۔ ذرا ٹھہر کر آنا...."

"آپ کو بھی ہماری حالت پر رحم نہیں آتا ؟" کریم نے اسے مایوسانہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے خانصاحب کی حکم عدولی کیوں کی بھائی، اب خمیازہ بھی بھگتو!"

"میں نے کون سی حکم عدولی کی ...... بچہ بیمار تھا ...... اس لئے ایک دن ان کا حکم نہ مان سکا...... اور پھر میں نے معافی بھی مانگ لی ...... اور یہ بھی دیکھئے، میں خانصاحب سے خیرات نہیں مانگتا...... بلکہ اپنی تنخواہ مانگتا ہوں۔"

"خیر تمہاری باتیں سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے ......" منشی نے سردی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا ٹھہر کر آجانا۔"

منشی نے دروازہ بند کر دیا۔ کریم زینے سے نیچے اترا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ "بیکسی ہیں، کوئی بھی کسی کا نہیں بنتا!"

"یہ آدمی کون تھا ؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"خانصاحب کا منشی تھا۔ اب کیا کریں ؟...... وہ معلوم نہیں کب آئے ؟"

"کسی اور جگہ چلو!" اور مریم نے بچے کو گود سے اٹھا کر شانے سے لگا لیا۔

"کسی اور جگہ ؟ کریم ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "تھوڑی دور مولوی صاحب کا مکان ہے، وہاں چلتے ہیں، رات وہیں بسر کریں گے!"

"ٹھیک ہے۔ مولوی لوگ رحم دل ہوتے ہیں...... وہاں ہمیں کھانے کو بھی مل جائے گا۔"

دونوں آگے چلنے لگے۔ ہوا کے جھونکوں میں زیادہ تیزی، زیادہ تندی پیدا ہو گئی تھی، کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وُہ مولوی صاحب کے خوبصورت مکان کے آگے کھڑے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں امید کی مدھم سی روشنی رونما تھی۔ کریم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک معمر و بزرگ شخص، جس کے سینے پر سفید و نورانی داڑھی بکھری ہوئی تھی اور ہاتھ میں تسبیح پکڑی ہوئی تھی، باہر آیا۔

"کیا ہے؟" مولوی صاحب نے فرمایا۔

"مولوی صاحب! ہم دو دن سے بھوکے ہیں..... بچّہ بیمار ہے....... آپ ..... ہماری امداد فرمائیں....... رات بھر ہمیں اپنے مکان میں رہنے دیں!"

"اور کہیں مرنے کی جگہ نہیں ہے...... ؟ میں وظیفہ پڑھ رہا ہوں!"

"مولوی صاحب! ہم پر رحم فرمائیں..... صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جائینگے ..... آپ مجھے جانتے ہیں کہ......"

"میں کسی کو نہیں جانتا..... بھائی یہاں سے چلے جاؤ۔ مَیں وظیفہ پڑھوں یا تمہیں سنبھالتا پھروں۔"..... مولوی صاحب کی انگلیاں ساتھ ساتھ تسبیح کے دانوں کو بھی حرکت دے رہی تھیں۔

"ہم سردی سے مَر جائیں گے!"

"تو جاؤ مرو! مجھے کیا کہتے ہو؟"

"آپ میں بھی رحم نہیں ہے؟"

"رحم کرنے کا بھی وقت ہوتا ہے۔ یہاں اتنے مکان ہیں۔ کیوں نہیں کسی اَور کے ہاں چلے جاتے؟" مولوی صاحب نے غضب ناک ہو کر کہا۔ اَور دروازہ بند کر دیا

دونوں حیران و ششدر وہیں کھڑے تھے۔

"یہ مولوی صاحب تھے۔" کریم نے چند منٹ کے بعد طنزاً کہا۔

"نہیں میں نہیں مانتی، مولوی صاحب ایسے نہیں ہو سکتے۔" مریم نے کہا۔

"تو یہ کون تھا؟"

"میں کیا جانوں۔"

"یہ مولوی صاحب تھے ...... مولوی صاحب .... میں نے کئی دفعہ نماز پڑھ کر ان کے ہاتھوں کو چوما ہے۔" ایک موٹر تیزی سے ان کے قریب سے گزر گئی۔

"یہ خان صاحب کی موٹر ہے۔" کریم نے کہا۔

"تو پھر چلیں۔"

"چلتے ہیں ..... اور اگر اس نے بھی ......!"

"چلو!" مریم نے اس کے الفاظ کاٹ کر کہا۔ وہ اس کا پورا فقرہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر خانصاحب کے دروازے کے آگے کھڑے تھے۔ کریم نے دروازے پر دستک دی۔ منشی نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"تم پھر آ گئے"! منشی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"خانصاحب آ گئے ہیں، ذرا مہربانی کر کے"...

"میرا کیا ہے، انہیں اطلاع دیئے دیتا ہوں۔" یہ کہکر منشی اندر چلا گیا۔ ایک منٹ کے بعد خانصاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔

"تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔ کریمو بدذات!" خانصاحب نے گرجتے ہوئے کہا۔

"حضور! میں بیمار ہوں .... بچہ بھی بیمار ہے .... اور بیوی دو دن سے

بھوکی ...... ہے "

" تمہاری یہی سزا ہے "

" حضور! میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟"

" اب میری نظروں سے دُور ہو جاؤ، پرسوں آ کر اپنے پیسے لے جانا!"

" حضور! اب ہم کہاں جائیں ...... رات بھر اپنے ہاں رہنے دیں ..... بچہ بیمار ہے ...... ہم دو دن سے بھوکے ہیں "

" میرا مکان سرائے نہیں ہے۔ جاؤ کسی سرائے میں جا کر ٹھہرو!"

" ہم پر مہربانی کیجئے!"

" مہربانی "۔ خانصاحب نے گرج کر کہا۔ اَور اپنے منشی کی طرف دیکھا۔ حنیف! اِس بدبخت کو دھکے دے کر یہاں سے اُتار دو۔"

" میں چلا جاؤں گا ..... مگر میری تنخواہ حضور!"

" مجھے کوئی تمہاری تنخواہ وِنخواہ نہیں دینی، جانتے ہو تو جاؤ، ورنہ ....."

" ورنہ آپ مار ڈالیں گے .... آپ خدا جو ہوئے۔ میری تنخواہ دیجئے۔ میں خیرات نہیں مانگ رہا۔"

" اسے کیوں نہیں دھکے دیتے حنیف! منہ اٹھائے کیا دیکھ رہے ہو؟ ایسے نمک حرام کو دروازے پر کیوں کھڑا رہنے دیا؟" خانصاحب نے خشمگین لہجے میں اپنے منشی سے کہا۔ منشی نے آگے بڑھ کر فاقوں سے نڈھال جسم کو دھکیلا۔ وُہ زینے سے نیچے گر پڑا۔ منشی اور خانصاحب اندر چلے گئے۔ دروازے کے بند ہونے کی زور سے آواز آئی مریم چیخ کر اپنے خاوند سے لپٹ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بچہ سنبھال رکھا تھا۔ اور دوسرے

ہاتھ سے خاوند کو جھنجوڑ رہی تھی۔

"شیرو کے میاں! شیرو کے میاں!!" وہ بار بار کہتی، خون میں شرابور بدنصیب انسان نے آنکھیں کھولیں اور بولنے کی کوشش کی، مگر نہ بول سکا۔ آنکھوں اور بازوؤں کی حرکت سے کچھ کہا۔۔۔۔ بارش زور سے ہونے لگی۔ سردی اس قدر تھی کہ الامان! دو زندہ جسم ایک خون آلود مردہ جسم پر جھکے ہوئے تھے۔

صبح کے وقت محلے کے لوگ تین نعشوں کے گرد کھڑے تھے۔ ان کے مراسم تدفین کے انجام دینے کے واسطے چندہ جمع ہو رہا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

"بیچارے سردی سے مر گئے۔"

ایک نے کہا۔

"ہاں! غریبوں کا دنیا میں یہی حال ہوتا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔

"لیکن یہ گھر سے کیوں نکل آئے؟"

تیسرے نے پوچھا

"خدا جانے مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی:"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ بازار میں پڑے ہیں۔ تو میں انہیں اپنے گھر لے جاتا۔" ایک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اب ہم لوگوں کو کفن دفن کا انتظام کرنا چاہیئے۔ چندہ کافی ہو گیا ہے۔"

"خانصاحب نے ان غریبوں سے بڑی ہمدردی کی ہے۔ کفن کے واسطے پندرہ روپے دیئے ہیں۔" یہ الفاظ کہنے والا خانصاحب کا منشی تھا۔

سب نے خاموشی سے خانصاحب کی ہمدردی کی تعریف سنی۔ ایک طرف سے مولوی صاحب گزر رہے تھے۔ وہ بھی وہیں ٹھہر گئے۔ تینوں کی نعشوں کو دیکھ کر، انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور دردناک آواز میں کہا۔

"خدا بڑا بے نیاز ہے"!

مجھ پر ان الفاظ کا بڑا اثر ہوا۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء

"آرمینہ" کے بہادر باشندے ویسے تو کئی سال سے اپنے وطن کی آزادی کے لئے خفیہ طور پر کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایک ماہ سے تو یہ جنگِ آزادی اتنی شدید صورت اختیار کر چکی تھی۔ کہ ہر روز قرائن سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ غروبِ آفتاب سے پیشتر ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر وطن پرستوں کی مسلسل جد و جہد اور ایثار و قربانی کے بعد "آرمینہ" آزاد ہو گیا۔

جنگِ آزادی میں سب سے نمایاں حصہ شباب نے لیا تھا۔ اس لئے آرمینہ کے باشندے

فطرۃً اپنے محسن کے دیدار کے لئے تڑپ رہے تھے۔ مگر افسوسناک امر یہ تھا۔ کہ انکا محبوب ترین رہنما کہیں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے ملک کا خفیہ سے خفیہ قیدخانہ تلاش کیا پوشیدہ سے پوشیدہ گوشہ چھان مارا لیکن شہاب کا پتہ نہ ملا۔ اس پر طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں۔ کوئی کہتا شہاب کی نعش کسی تہ خانے میں دفن کر دی گئی ہے۔ کسی کا قول تھا کہ اس بہادر سپاہی کو قتل کر کے سمندر میں بہا دیا گیا ہے۔ اور کسی کی رائے تھی وطن کے دشمنوں نے اسے جلاوطن کر دیا ہے، الغرض ایک کی رائے دوسرے کی رائے سے نہیں ملتی تھی۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ آرمینیہ اپنے بہادر ترین فرزند سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا ہے۔

اب شہاب کی یادگار کا سوال درپیش تھا۔ ملک کے مختلف طبقوں نے اپنی رائے پیش کی اور آخر اہل الرائے اشخاص کے باہمی مشورے سے اس کا فیصلہ ہو گیا۔ شہر کے سب سے بڑے دروازے کے قریب، آرمینیہ کے مرحوم راہنما کا ایک عظیم الشان مجسمہ قائم کیا گیا۔ جس کے نیچے سنگِ مرمر کے چبوترے پر مرحوم کے چیدہ چیدہ کارنامے کندہ کئے گئے اور مجسمے کے گردا گرد ایک نہایت خوبصورت اور وسیع باغ لگوایا گیا۔ چونکہ یہ باغ شہاب ہی کی یادگار تھا۔ اس لئے اس کا نام "شہاب باغ" پڑ گیا۔

(۲)

جنوبی افریقہ کی وحشی قوم کے پنجے میں گرفتار ہو کر، آزادی کا تصور کرنا ایک امرِ محال سے ایک غیر ممکن سی بات ہے۔ مگر شہاب نے پیہم حوصلہ فرسا ناکامیوں کے باوجود اپنی کوشش جاری رکھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ سال تک ہمت شکن مصائب برداشت کرنے کے بعد وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور جس وقت اس نے جہاز کی

پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ اس کے دل میں گونا گوں امیدوں کا ہجوم بیقرار، اور اس کے سینے میں بے پایاں مسرتوں کا سیلاب موجزن تھا۔ پیارے وطن کی پیاری یاد اس کی رگ رگ میں ایک میٹھی سی خلش، ایک سرور انگیز سی چبھن اور ایک لذیذ سا درد پیدا کر رہی تھی۔ آخر طویل سفر کے بعد وُہ منزل مقصود پر پہنچ گیا۔

جیسے ہی آزمیسنہ کا بڑا دروازہ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا، وہ اس طرح بیتاب ہو گیا جس طرح ایک ننھا بچہ اپنی پیاری ماں کا مسکراتا ہوا چہرہ اور پھیلے ہوئے بازو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ بیقرار، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے دروازے کی پیشانی پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی مسرت کی ایک ہلکی سی چیخ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گئی ـــــ دروازے کی بلندی پر آزمیسنہ کا اپنا جھنڈا لہرا رہا تھا ـــــ اس کے دیرینہ خواب کی روح نواز تعبیر پرچم کی رنگینیوں میں بکھر رہی تھی۔

اب شام کی تاریکی پھیل چکی تھی اس لئے ادھر اُدھر شاذو نادر ہی کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ وُہ دروازے کے اندر داخل ہوا۔ معاً اس کی نگاہ قریب کے باغ میں لوگوں کے ہجوم پر پڑی۔ وہ بعجلت وہاں پہنچا۔ اور جیسے ہی مجسمے کو دیکھا۔ وُہ کچھ ٹھٹک سا گیا، گھبرا سا گیا۔ چند لمحے حیرت کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد وہ مجسمے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اور چبوترے کے حروف کو پڑھنے لگا۔ پتھر میں بڑے بڑے حروف میں کندہ تھا۔ "آزادی کا ہیرو ـــــ شہاب"!

یہ الفاظ پڑھتے ہی اس کا چہرہ عالمِ جوش میں سرخ ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہُوا کہ وہ فضا میں اُڑتا جا رہا ہے ـــــ بلند سے بلند ہوتا جا رہا ہے۔ چند لمحے تو اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور کس عالم میں کھڑا ہے ... نہ معلوم اس کی یہ

حالت کب تک قائم رہتی کہ پاس کھڑے ہوئے ایک شریر لڑکے نے اس کی مضحکہ خیز حرکت پر زور سے قہقہہ لگایا۔ شہاب نے تحریر کو دوبارہ پڑھا، سہ بارہ پڑھا۔ پھر مجسمے کو دیکھا اور اس کے بعد متحیرانہ مجمع کو دیکھنے لگا۔ تمام لوگ اسکی بے معنی حرکات پر حیران تھے اور شہاب کے متعلق ایک عجیب و غریب رائے قائم کر رہے تھے۔

شہاب نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر فرطِ جوش سے لرزتی ہوئی زبان میں کہا۔ "آج تمہارا شہاب تمہارے سامنے آ گیا ہے۔"

کئی لوگ تو اس عجیب و غریب انکشاف پر قہقہے لگانے لگے۔ اور کئی گھور گھور کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ گویا وہ کوئی حیرت انگیز انسان ہے۔ شہاب نے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے اب قہقہے زیادہ بلند ہو گئے۔ اس پر شہاب نے جنگِ آزادی کے چیدہ چیدہ واقعات کے ساتھ اپنے زمانہ اسارت کی تفصیل بھی سنائی اور انہیں بتایا کہ کس طرح وہ جنگ کے دوران میں جلاوطن کر دیا گیا تھا اور کیونکر وحشیوں کے پنجے میں گرفتار رہا۔ ہنسنے والوں کی نگاہیں فرطِ ندامت سے جھک گئیں اور گھورنے والی نظریں اس دلنواز خوشخبری سے چمکنے لگیں۔

تمام شہر میں یہ خبر کہ آرمینہ کا بطلِ جلیل زندہ واپس آ گیا ہے آگ کی طرح پھیل گئی حکومت نے انتہائی احترام و عظمت کے ساتھ اسے اپنا مہمان بنایا اور دوسرے روز صبح کے وقت ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا جس میں ملک کے ہر ایک باشندے نے شرکت کی۔ شہاب کی گاڑی پھولوں سے بھر گئی، نہ صرف گاڑی بلکہ جس راہ سے وہ گزرتا۔ وہ راہ بھی پھولوں سے لد جاتی۔ شام تک یہ شاندار جلوس ملک کے مختلف بازاروں اور سڑکوں پر گزرتا رہا اور اس دوران میں اہل آرمینہ نے اپنے محترم راہنما کی انتہائی عزت، انتہائی عظمت کی۔

رات کے ابتدائی حصے میں یہ جلوس "شہاب باغ" میں جا کر منتشر ہوا اور وہاں سے شہاب

عزت و تکریم کے ساتھ شاہی محل میں پہنچا دیا گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور اِس دوران میں شہاب کی اس طرح پرستش ہوتی رہی گویا وُہ کوئی آسمانی وجود ہے۔ دوسرے مہینے کا آغاز ہوا۔ شہاب نے محسوس کیا کہ اب لوگوں کے جوشِ محبت میں ایک حد تک کمی واقع ہو گئی ہے اور وُہ خود یہی چیز چاہتا تھا۔ لوگوں کے پرستارانہ جذبات سے وُہ تنگ آ چکا تھا۔ تیسرا مہینہ شروع ہوا جوش اور کم ہوا۔ اور چوتھے مہینے تو شہاب کو یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی ایک عام آدمی ہے۔ ایک معمولی شہری، شاہی خدام اس سے بھاگنے لگے اور ہر شخص اسے اس طرح دیکھنے لگا جس طرح کسی عام آدمی کو دیکھا جاتا ہے۔ کچھ دن کے بعد تو اس کی رہی سہی عزت و تکریم بھی ختم ہو گئی شاہی خدام نے تو قطعاً کنارہ کشی کر لی اور وہ ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی محتاج ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ آخر یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک تو اتنی عزت کہ لوگ جھک جھک کر اس کے پاؤں چومیں اور ایک یہ بے پروائی کہ کوئی اسے پوچھتا ہی نہیں۔ اور وُہ ضروریاتِ زندگی تک کے لئے محتاج ہو گیا ہے۔

آخر مجبور ہو کر وہ اپنے مکان میں چلا آیا۔ عزیزوں نے چند دن تو اس کی خوب خاطر مدارت کی۔ اس کے بعد وہ بھی بے پروائی سے پیش آنے لگے۔ شہاب نے ملازمت کے لئے حکومت کی خدمت میں کئی بار درخواست کی، مگر ہر بار حکومت کی طرف سے یہ جواب ملا۔ "آپ ایسے محسنِ وطن کو ملازم رکھنا احسان فراموشی کے مترادف ہے۔ آپ کی جگہ تو ہمارے دلوں اور آنکھوں میں ہے نہ کہ ان معمولی دفتروں میں۔"

(۳)

آج شہر میں یومِ آزادی منایا جا رہا تھا۔ ایک شاندار جلوس نکالا گیا۔ جو "شہاب باغ" میں آ کر منتشر ہو گیا۔ وہاں آتش بیان مقررین کرام نے جنگِ آزادی کے واقعات دہرائے

اور خلوص و محبت کے جذبات کا "ادنےٰ ہدیہ" جنگِ آزادی کے ہیرو کے حضور میں پیش کیا گیا۔ لوگوں نے پھولوں کے ہار مجسمے کے گلے میں ڈالے اور نئی سکیم کے مطابق مجسمے کے گرد چاندی کا کٹہرا لگایا گیا۔

دوسرے دن صبح کو چند لوگ "شہاب باغ" میں سیر کر رہے تھے کہ یکایک ان کی نگاہیں مجسمے کے قریب ایک نعش پر پڑیں۔ وہ تیزی کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اور نعش کو غور سے دیکھنے لگے۔ اور یہ معلوم کر کے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ نعش شہاب کی ہے۔

نعش کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے یہ کاغذ اٹھایا، اور اسے پڑھنے لگے۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

" میرے پیارے ہموطنو! میں سردی اور بھوک کی شدت سے مر رہا ہوں۔ براہِ کرم میرے جسم سے خون نکال کر میرے عظیم الشان مجسمے پر لگا دیجئے۔ خون کی سرخی سے مجسمے کی آرائش و زیبائش میں اضافہ ہو جائے گا — اس مہربانی کے لئے میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔

"شہاب"

نومبر سنہ ۱۹۳۷ء

بوڑھا نادو ہر روز علی الصبح مچھلی پکڑنے کا پرانا اور فرسودہ سامان لے کر، دریا کے کنارے آجاتا۔ ایک میلی کچیلی چٹائی، جو نہ معلوم کتنے عرصے سے اس کے پاس تھی، ریت پر بچھا دیتا۔ کانٹے میں آٹا لگاتا اور خدا کا نام لے کر ڈوری کو پانی میں پھینک کر چٹائی پر بیٹھ جاتا۔ ریت میں ایک موٹی سی دوشاخہ لکڑی گاڑ دیتا اور ڈوری اس میں سے گزار دیتا۔ کبھی تو جلد ہی چار پانچ مچھلیاں ہاتھ آجاتیں، جنہیں وہ تھیلے میں ڈال کر خوشی خوشی گھر کو روانہ ہو جاتا۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ گیارہ بج گئے ہیں اور ایک مچھلی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ مگر اس مایوسانہ حالت میں بھی وہ بیٹھا رہتا۔ یہاں تک

کہ آفتاب نصف النہار پہ پہنچ جاتا اور حدّتِ آفتاب کی شدت سے تنگ آکر، دریا پہ مایوس نظریں ڈالتے ہوئے گھر کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔

دریا پر کئی شکاری آتے تھے۔ بعض ڈوری کے ساتھ شکار کرتے تھے اور بعض جال کے ساتھ۔ مگر جس استقامتِ طبع ــــ اور پابندی وقت کے ساتھ بوڑھا نادو اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ اس سے باقی تمام شکاری محروم تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نادو کا ذریعہ معاش صرف مچھلی پکڑنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی۔ جس میں اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ ننھی اصغری اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اس طرح وہ ہر روز اس سے ملتا تھا۔ اس کی پیاری پیاری باتیں سنکر دل بہلاتا تھا۔

اپنے ہم پیشہ لوگوں اور اپنے احباب و اقارب سے وہ بہت کم بولتا تھا۔ کوئی ضروری بات ہوئی تو کہہ دی ورنہ اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف! اس کے جاننے والے اس کے متعلق بہت کم جانتے تھے۔ لوگوں کو صرف اتنی خبر تھی کہ وہ نہایت غریب آدمی ہے۔ جس کی گزران اوقات مچھلی کے شکار پر ہے۔ اور شہر کے غریب طبقے میں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ــــ کچھ بھی نہیں جان سکتے تھے۔ کسے خبر تھی کہ یہ بوڑھا نحیف و نزار، غریب و مفلس انسان جو ہر روز نور کے تڑکے دریا کے کنارے مچھلیوں کا شکار کرتا ہے خود قسمت کا شکار ہے۔

عالمِ جوانی میں وہ ذی حیثیت آدمی تھا۔ شہر میں تین چار مکان تھے۔ ان کے علاوہ کچھ زمین بھی تھی۔ مسرت و فارغ البالی کے سائے میں وہ زندگی بسر کر رہا تھا کہ قسمت نے پہلا تیرِ ستم اس کے سینے پر مارا! اس کا بڑا لڑکا چند مہینے بیمار رہ کر مر گیا۔ نادو رو پیٹ کر، صبر کر کے بیٹھ رہا۔ ایک سال بعد اس کا دوسرا لڑکا ــــ اسکی آنکھوں کا تارا! موت کی تاریکیوں

میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ ان صدموں کی تاب نہ لا کر اسکی بیوی بھی دنیا سے چل بسی۔ اسکی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رشتہ داروں نے بھی اُسے لوٹنا شروع کر دیا اور کچھ عرصے کے بعد وہ دُنیا میں بے یار و مددگار تھا۔ اس کی رفیقۂ حیات، اس کے جگر پاروں کو موت نے چھین لیا تھا۔ اور اس کی جائداد اُس کے رشتہ داروں نے۔ یہ تھی اس کی گزشتہ زندگی کی رُوداد، جسے وہ کبھی بھی کسی کو سنانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اب اس کی زندگی میں صرف دو دلچسپیاں باقی تھیں۔ مچھلی پکڑنا اور ننھی اصغری سے باتیں کرنا۔

اصغری ایک ماہی گیر کی بیٹی تھی جو دریا کے قریب ہی رہتا تھا۔ اصغری اسکی اکلوتی بیٹی تھی اور نہایت ذہین و ہوشیار، جب وہ طفلانہ معصومیت سے ننھے منے ہاتھ اسکی گردن میں ڈال کر میٹھی میٹھی زبان میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی تو بوڑھے کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔ مغموم دل کی کلی جس سے تلخ واقعات کے سموم انگیز جھونکوں نے زندگی کا ولولہ و جوش تازگی و شادابی چھین لی تھی، کھل کر گلِ خنداں کی صورت اختیار کر لیتی اور وہ فرطِ مسرت سے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیتا۔

نادو، ہر روز دریا کے کنارے بیٹھ کر، اس کا انتظار کرتا رہتا۔ وہ چپکے سے آتی اور سب سے پہلے بوڑھے کے تھیلے میں ہاتھ ڈالتی۔ اگر کوئی مچھلی ہوتی تو اسے اٹھا کر بوڑھے کے ہاتھ کے پاس رکھ دیتی۔ جب بوڑھے کا ہاتھ اس پر لگتا تو وہ زور سے قہقہے لگا کر دور جا کھڑی ہوتی، یا کوئی چھوٹی مچھلی اس کی قمیص میں ڈال دیتی، بوڑھا متبسم ہو کر قمیص میں ہاتھ ڈال کر مچھلی نکالنے لگتا، اور ساتھ ہی کہتا بڑی شریر ہے تو اچھی!

"میں نے کیا شرارت کی ہے بابا؟"

"یہ کیا کیا؟ مچھلی میری قمیص میں ڈالدی؟"

"میں تو ابھی آتی ہوں۔"

"تو ابھی آکر ہی شرارت کی ہے نا؟"

"بابا! ہر وقت تم میرا نام ہی لگاتے ہو۔ اور کسی کا نام کیوں نہیں لیتے۔ میں ہی شرارت کرنے والی رہ گئی ہوں۔"

"تمہارے سوا اور کون ہے؟"

"وہ دیکھو کتنے آدمی بیٹھے ہیں۔ ننھی اصغری دور، دریا کے کنارے شکاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی۔

"تو انہوں نے آکر میری قمیص میں مچھلی ڈال دی؟"

"ہاں ۔۔ بڑے شریر ہیں، ٹھیک ہے نا بابا؟" ۔۔ قہقہہ لگا کر وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ جاتی۔

"شریر اچھی!" یہ کہتے ہوئے نادو مسکراتا اور اپنے شغل میں مصروف ہو جاتا۔

"آج کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں بابا!"

"تم تو آتے ہی تھیلے کو دیکھتی ہو اور اب مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ بابا! کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں۔"

"وہاں تو صرف دو ہیں۔"

"تو سمجھ لو دو ہی پکڑی ہیں۔"

"بابا! کل تو اس وقت تک تم نے چار پکڑ لی تھیں۔"

"کل کی بات کل کے ساتھ گئی۔"

آج زیادہ پکڑو ۔۔ اور بابا! میرا دل چاہتا ہے۔ ان بیچاریوں کو ان کے

گھر پہنچا دوں۔"

"کن کو؟"

"اِن مچھلیوں کو، بیچاریوں کو پکڑ رکھا ہے۔ کیا فائدہ؟"

"پہنچا دو، اور میں انہیں دریا میں پھینک دوں گا۔"

"میں بھاگ جاؤں گی۔"

"تو میں نہیں بھاگ سکتا۔"

الغرض اس قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بوڑھے نادو کو ننھی اصغری سے اتنا پیار، اتنی محبت تھی۔ جتنی ایک والد کو اپنی اولاد سے بھی نہیں ہو سکتی!

وقت گزر ناچار ہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ نادو کی پدرانہ محبت بھی بڑھتی جارہی تھی، ننھی اصغری اسکے پاس بیٹھی رہتی اور وہ جانے لگتا تو کہتی "بابا! آج تم دیر سے آئے تھے۔ کل سویرے آنا۔" نادو دوسرے دن زیادہ سویرے آتا اور ننھی اصغری فوراً اس کے پاس پہنچ جاتی۔ باپ اُسے روکتا کہ "ابھی اتنی سویرے نہ جاگا کرو، بیمار ہو جاؤگی۔" مگر وہ نادو کے پاس جانے سے نہ رکتی۔

(۲)

اصغری ایک غریب، مفلوک الحال اور دائم المرض ماہی گیر کی اکلوتی بیٹی تھی، ماں کو وفات پائے چار سال گزر چکے تھے۔ دنیا میں ماں کی دائمی جدائی سب سے زیادہ مصیبت ناک سب سے بڑھ کر الم انگیز اور سب سے بڑا حسرتناک واقعہ ہے۔ مگر باپ کی محبت اور بوڑھے ماہی گیر کی پدرانہ شفقت نے بچی کے ننھے دل سے اس صدمہ و غم کے اثرات کو بہت حد تک زائل کر دیا۔ وہ گھر پر ہوتی تو باپ کی پدرانہ محبت کے راحت انگیز سایے میں مسرورانہ قہقہے لگاتی۔

اور بوڑھے ماہی گیر کے پاس ہوتی، تو خود کو باپ سے بھی بڑھ کر محبت کرنے والی ہستی کے مسرت بخش آغوش میں پاتی۔ باپ دائم المرض ہونے کے باوجود ہر وقت اس کا خیال رکھتا تھا۔ اور بوڑھا ماہی گیر غریب ہوتے ہوئے بھی سب کچھ اس پر نثار کرنے کے لئے تیار تھا اور نثار کر رہا تھا۔ وُہ بے حد مسرور تھی۔ لیکن اس کی مسرت زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ وقت کے ہاتھوں نے غم کا زہراب اس کے شہد چشیدہ ہونٹوں سے لگا ہی دیا۔ اس کا باپ، ماں سے بڑھ کر پیار کرنے والا باپ، اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ ننھی اصغری کے دل میں کبھی بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس کا پیارا باپ اسے دائمی جدائی کا زندگی کش صدمہ دے جائے گا۔ اس کے ننھے دماغ میں ہرگز یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ دنیا میں اتنا بڑا صدمہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح ایک ندی پہاڑ کے آ جانے سے یک لخت رُک جاتی ہے۔ اسی طرح مسرتوں کی منزل کو طے کرتی ہوئی اسکی خوش نصیب زندگی اس صدمے کے احساس سے خاموش، مایوس اور گم سم ہو کر رہ گئی۔ اس وقت جبکہ صدمے کا تلخ ترین احساس اسے موت کے قریب لا رہا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر کی بے پایاں محبت نے اسکی معصوم زندگی کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لیا۔ باپ مر گیا۔ مگر باپ سے زیادہ محبت و شفقت کرنیوالے بوڑھے نے اسے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ باپ کی موت کا حادثہ معمولی حادثہ نہیں تھا۔ لیکن بوڑھے کے پدرانہ سلوک نے اس کا غم دور کر دیا۔ اب وُہ پھر مسرور تھی۔ پہلے سے بھی بڑھ کر مسرور!

نادو بے حد غریب تھا مگر اصغری کی کوئی ضرورت ایسی نہ تھی جسے وہ پوری نہ کرتا ہو۔ بعض اوقات وہ خود بھوکا رہتا۔ لیکن بچی کو نفیس کھانا دیتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اصغری نے کسی چیز کی آرزو لبوں سے نکالی ہو اور بوڑھے نے اسے پورا نہ کر دیا ہو۔

اب اصغری بارہ سال کی ہوگئی تھی۔ بوڑھا نوجوانانہ ہمت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے پیشِ نظر اصغری کا مستقبل تھا۔ جسے وہ زیادہ سے زیادہ شاندار بنانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے بوڑھے، کمزور اور ضعیف ہاتھوں میں کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ کہ وُہ زیادہ وقت محنت و مشقت میں صرف کرتا تھا اور تکلیف کا ذرہ بھر احساس نہ کرتا تھا۔ لوگ اس کی ہمت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے ـــ اصغری جوان ہو رہی تھی، اور اس کے حسن و جمال میں برابر ترقی ہو رہی تھی۔ ماہی گیر کی انتہائی خواہش تھی کہ اصغری کی شادی امیرانہ شان و شوکت سے کرے اور اس کے لئے روپے کا فراوانی کے ساتھ موجود ہونا اشد ضروری تھا۔ اس لئے ماہی گیری چھوڑ کر وہ مختلف کام کرنے لگا تھا۔

آج ایک مدت کے بعد اصغری کے اصرار پر وُہ دریا پہ آیا تھا۔ اصغری بھی اس کے ساتھ تھی۔ دریا میں ڈوری پھینک کر ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا وہ مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اصغری اس کے قریب بیٹھی ہوئی دریا کی ساحل سے ٹکراتی ہوئی لہروں کا منظر دیکھ رہی تھی۔ یکایک وہ اٹھی اور کنارے پر ٹہلنے لگی۔

"کہیں دور نہ جانا!" بوڑھے نے کہا۔

"نہیں بابا! میں یہیں ہوں۔"

بوڑھا ماہی گیر اپنے خیالات کے ہجوم میں غرق ہو گیا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ "کانٹے" کے ساتھ مچھلی لگی ہے یا نہیں ـــ اصغری اس کے قریب ٹہل رہی ہے یا دور نکل گئی ہے۔ اس وقت اس کے پیشِ نظر صرف ایک چیز تھی اور وہ تھی اصغری کی شادی۔ بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ یکایک اسے اصغری کا خیال آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر

دیکھا۔ اصغری وہاں نہیں تھی .... اس نے آواز دی مگر جواب ندارد۔ اس نے سمجھا۔
کہیں دور چلی گئی ہے۔ ابھی آجائے گی، اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مچھلی پکڑنے کا
سامان تھیلے میں ڈالا اور ایک اونچے سے تودے پر چڑھ کر اصغری کو دیکھنے لگا۔ مگر اصغری
کی صورت کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی ـــــ بوڑھے کے دل میں اضطراب پیدا ہوا۔ نیچے اتر
کر وہ اس طرف چلنے لگا۔ جدھر اصغری کو اس نے جاتے دیکھا تھا۔ کافی دور چلا گیا مگر اصغری
کہاں؟ اس کا اضطراب بڑھنے لگا۔ اِدھر اُدھر اصغری کے متعلق پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہ دے
سکا۔ دو گھنٹے تک وہ اصغری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ایک روح کش خیال اس کے
دماغ میں آرہا تھا۔ اور وہ تھا "شاید اصغری دریا میں ڈوب گئی ہے۔ جب قوتِ واہمہ
ہولناک صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتی تو اس پر بجلی ٹوٹ پڑتی، دنیا آنکھوں
تلے تاریک ہو جاتی، اور کائنات، اس کی نگاہوں کے سامنے خون کی لہروں پر لرزنے لگتی، مایوس
ہو کر وہ دریا میں کودنے ہی لگا تھا کہ لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور اسکی ڈھارس بندھائی۔ انہوں
نے کہا، ممکن ہے لڑکی گھر چلی گئی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا اور
وہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا وفورِ اضطراب سے دھڑکتے ہوئے دل کو سینے میں لئے گھر کی
طرف بعجلت چلنے لگا۔ اصغری وہاں بھی نہیں تھی۔ اسکی درخشاں امیدیں جو مدت سے اس کے
سینے کو منور کر رہی تھیں مایوسی کی تاریکیوں کے سائے میں دم توڑنے لگیں۔ "اصغری کہاں
گئی، اُسے کون لے گیا۔ دریا میں غرق ہو گئی۔" اس قسم کے خیالات نے اُسے نیم مجنوں بنا دیا۔
اسے محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کوئی سخت بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ بیچارے نے دریا کا، شہر
کا چپہ چپہ چھان مارا، مگر اصغری کا نشان پتا بھی نہ مل سکا۔ اس جانگداز صدمے نے بوڑھے
کی کمرِ ہمت توڑ دی۔ اس کی جوانانہ سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ یہ وہ صدمہ تھا جو اسے مار دیتے

کے لئے کافی تھا۔ تاہم یہ امید کہ اصغری مل جائے گی، اس کے دل میں موجود تھی، اور اسی امید نے اس کے اور موت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی، اسی امید نے قبر کی طرف جاتے ہوئے بوڑھے اور بدنصیب باپ کے قدم روک لئے۔ اس نے تمام محنت و مشقت چھوڑ دی، وہ ہر روز علی الصبح ڈوری لے کر دریا پر اسی جگہ جا بیٹھتا، جہاں اسکی آرزوؤں نے اسے دھوکا دیا تھا۔ بعض اوقات تو سارا سارا دن وہ وہیں بیٹھا رہتا۔ اور مجنونانہ انداز میں اصغری کو آوازیں دیتا رہتا — یہ تھی اس کی زندگی — یہ تھا اصغری کی جدائی کا صدمہ!

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سینکڑوں زخم جو وقت نے لوگوں کے سینوں پر لگائے تھے۔ امتدادِ وقت سے مندمل ہو گئے تھے۔ ہزاروں سینوں پر نئے زخم لگ رہے تھے۔ راحتیں مصیبتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور مصیبتیں راحتوں میں، زمانے کا ہمیشہ بہنے والا سمندر بدستور رواں تھا۔ کوئی اس کے کنارے سے خزف ریزے اٹھا رہا تھا اور کوئی اس میں سے موتی حاصل کر رہا تھا۔ انسان ہزاروں دکھ بھول گئے، مگر بوڑھا ماہی گیر اپنا صدمہ نہ بھلا سکا تھا۔ روتے روتے اس کی بصارت بےحد کمزور ہو گئی تھی۔ مگر دریا پر جانا جا کر اسی جگہ بیٹھنا اس نے نہ چھوڑا تھا۔

(۳)

ریاست فرحت نگر کے موجودہ حکمران کی چہیتی بیوی "مہ رُخ" اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کو ساتھ لئے کشتی کی سیر کر رہی تھی کشتی کے ایک حصے میں اس کی سہیلیاں اور خادمائیں بیٹھی تھیں۔ اور دوسرے حصے میں ایک خوبصورت قیمتی اور دلآویز کوچ پر وہ لیٹی تھی اسورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ فضا میں نیم روشن اور نیم تاریک سائے گھل مل رہے تھے۔ اس وقت اسکی ہر سہیلی اور ہر خادمہ مسرور تھی۔ مگر وہ جسے سب سے زیادہ مسرور اور سب سے بڑھ کر خوش ہونا

چاہیئے تھا کسی حد تک مغموم تھی، اس کی سہیلیاں طرح طرح کے تفریحی مشاغل میں مصروف تھیں مگر وہ ان سب سے بے خبر تھی۔ اس کی نگاہیں دریا کی سطح پر کاغذ کے ایک حقیر ٹکڑے کو خشمگیں لہروں کی مسلسل ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اور اس کا ذہن خیالات کی موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا کسی اور دُنیا میں جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ماضی کا پردہ چاک ہوا، اب وہ ایک اور دنیا میں تھی، ایک ایسی دنیا میں، جہاں آج سے کئی سال پہلے غریب ہونے کے باوجود وہ مسرور تھی۔

وہ ماہی گیر کی بیٹی تھی مگر بہت خوش، باپ کے مرنے کے بعد ایک بوڑھے ماہی گیر کی بے پایاں محبت نے اسے زندگی کی تمام ضروریات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کے لئے ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں مادرانہ محبت بھی تھی اور پدرانہ شفقت بھی، ایک دن دریا کے کنارے وہ ٹہل رہی تھی۔ کہ اچانک ایک سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی آہٹ اس کے کان میں آئی، وہ ابھی دوسری طرف دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی نگاہوں نے قریب ہی ایک رعنا نوجوان کو دیکھا۔ لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نوجوان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر اسے گھوڑے پر بٹھا کر ہوا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ ایک نہایت شاندار محل میں تھی۔ ریاست فرحت نگر کے ولیعہد نے اس سے نام اور خاندان کا پتہ پوچھا۔ مگر وہ خاموش رہی، مرعوبانہ سکوت اس پر طاری رہا چند دن کے بعد ریاست کی فضاؤں میں یہ خبر گونج رہی تھی کہ ولیعہد ایک نہایت ممتاز خاندان کی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ اور یہ نہایت ممتاز خاندان کی لڑکی کون تھی؟ ماہی گیر کی چھوکری۔

یہ تمام واقعات اس کے ذہن میں پھر رہے تھے۔ آخری واقعے کے ذہن میں آتے ہی

وہ اُٹھ بیٹھی۔ بوڑھے بابا کی یاد اس کے دل میں آئی۔ اور وہ اس کے احسانات، اس کی محبت، اور اس کی پدرانہ شفقت کو یاد کرنے لگی۔

کشتی پانی کے سینے پر بہے جا رہی تھی۔ اور اس میں سے کیف آور نغمات کا ہجوم اُٹھ اٹھ کر، فضا میں رقص کرتا ہوا مستیاں بکھیر رہا تھا۔" مہ رُخ" کا ذہن گزشتہ واقعات کے جھولے میں جھول رہا تھا۔ محل میں پہنچتے ہی عزت و عظمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسی بلند سطح پر بٹھا دیا تھا کہ جہاں انسان خود کو دوسرے انسانوں سے ممتاز سمجھتا ہے ۔۔۔ ممتاز سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مسرت و عشرت کی فراوانی نے اس کے دل سے گزشتہ واقعات کے بدنما نقوش کو مٹا دیا۔ وہ اب ایک جلیل القدر انسان کی جلیل القدر بیوی تھی۔ عیش و عشرت میں مدہوش عورت کو کیا معلوم تھا۔ کہ اس کے محل سے بہت دور دو ضعیف، بے نور آنکھیں ہر وقت اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ زندگی کی یہ دردناک ٹریجڈی روزِ ازل سے ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

کشتی کافی دیر تک بہتی رہی پھر کنارے پر آ لگی۔ کیونکہ اب کنارے پر پروگرام تھا۔ ایک طرف ریشمیں خیمہ لگا ہوا تھا۔ وہ سہیلیوں اور خادماؤں کے جھرمٹ میں اس کی طرف چلنے لگی۔ یکایک ایک منظر دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ کچھ دور کنارے پر ایک بوڑھا ضعیف شخص بیٹھا تھا۔ مہ رُخ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

"حسنو! دیکھو وہ کون شخص ہے۔" اس نے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خادمہ سے کہا۔

"ماہی گیر ہے شاید۔"

"اسے بلا کر لاؤ نا۔" مہ رخ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟" ایک سہیلی نے کہا۔

"تاہم میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ بیچارہ بوڑھا ہے۔"

ایک خادمہ دوڑی دوڑی وہاں گئی۔ اور بوڑھے کو ساتھ لے کر آنے لگی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا ہوا بوڑھا اس طرح دکھائی دیتا تھا۔ گویا ہوا میں چراغ کا شعلہ لرز رہا ہے۔ یا کسی بدنصیب کے سینے پر غم کا بوجھ گر رہا ہے۔ بوڑھا قریب آگیا۔ مہ رُخ نے اسکی صورت دیکھی۔ جو کیفیت ابلتے ہوئے پانی کی ہوتی ہے۔ وہی کیفیت اس کے دل کی تھی۔ بوڑھے کی بے نور آنکھیں اسکی روح کی گہرائیوں میں جھانک رہی تھیں۔ مہ رُخ کے سامنے وہی بوڑھا کھڑا تھا جس نے اس کے ساتھ پدرانہ شفقت کی تھی۔ مہ رُخ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بابا! تم مچھلیوں کا شکار کرتے ہو؟" ایک سہیلی نے کہا۔

"ہاں، مجھے آپ نے کیا کہنا ہے؟"

"بابا! تم بڑے غریب معلوم ہوتے ہو۔" مہ رخ نے کہا۔

اندھے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے سر کو دائیں بائیں پھرایا۔

"آپ کون ہیں؟" بوڑھے نے ایک ایسے لہجے میں کہا۔ جس میں اس کی روح کا جوش پوشیدہ تھا۔

"ریاست فرحت نگر کے حکمران کی بیگم۔" ایک سہیلی نے کہا۔

"مجھے آپ کی آواز سن کر۔۔۔" آگے بوڑھے سے بولا نہ گیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" مہ رخ نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں، کئی سال گزر گئے میری ایک بیٹی تھی، اصغری اس کا نام تھا۔ مجھے اس

سے بے حد محبت تھی۔ میری زندگی کا وہ سہارا تھی۔ اچانک ایک دن یہیں سے وہ غائب ہو گئی۔ خدا معلوم دریا میں ڈوب گئی یا اسے کوئی لے گیا۔" اتنا کہتے ہوئے بوڑھے کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو گرنے لگے۔ "آپ کی آواز بالکل میری اصغری کی آواز ہے ـــــ آپ کہاں ہیں۔ مجھے اپنا ہاتھ دیجیے۔"

یہ کہکر اس نے قدم آگے بڑھایا۔ آگے ایک پتھر تھا۔ جس سے وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ ماہ رُخ نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ "روز ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ مگر جو ٹھوکر اصغری نے لگائی ہے۔ وہ کبھی نہیں بھولوں گا۔"

ماہ رخ کے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ بے اختیار چاہتی تھی۔ کہ اس سے لپٹ جائے۔ لپٹ کر کہے "میں ہی اصغری ہوں بابا! ـــــ بابا!" مگر اس کے ہاتھ رُک گئے وہ ایک بڑی ریاست کے حکمران کی بیوی۔ اور ایک مفلس و قلاش بوڑھے کی بیٹی؟؟

اس نے گلے سے ہار اتارا۔ اور بوڑھے کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "لے بابا! تیرے کام آئے گا۔"

"یہ کیا ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"قیمتی موتیوں کا ہار تیس چالیس ہزار کا ہے۔ بابا! تیری اور تیرے خاندان کی قسمت جاگ اٹھی۔" ایک سہیلی نے کہا۔

"میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں، میں اسے لے کر کیا کروں گا ـــ لے لیجئے۔" یہ کہکر ہار اس نے بڑھایا۔

"تو پھر ہم تمہاری کیا مدد کریں؟"

"میری اصغری اگر کہیں مل جائے تو اسے کہنا۔ تیرا بابا روتے روتے اپنی آنکھوں کا

نو بھی کھو چکا۔"

مہ رخ کے دل پر چوٹ لگی۔ مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

بوڑھا چلنے لگا۔ اس کا ہر قدم مہ رخ کے دل پر چوٹ لگاتا تھا۔۔ ایک سلئے کی طرح وُہ چلتا گیا۔۔ مہ رخ اسے دیکھتی رہی۔۔۔۔ کچھ دیر کے بعد بوڑھا نظروں سے غائب ہو گیا۔

"آپ خاموش کیوں کھڑی ہیں۔۔ بڑی رحمدل ہیں" ایک سہیلی نے کہا۔

"اتنا قیمتی ہار دیا تھا اس کو۔۔ مگر وہ تھا ہی بدنصیب۔" دوسری سہیلی نے کہا۔

"اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔" تیسری بولی۔

اب کھانا تیار ہو چکا تھا۔ اس کی سہیلیاں بیٹھنے لگیں۔ مہ رخ چپکے سے اٹھی۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ اپنی سہیلیوں کی نظروں سے دور، وُہ ایک درخت سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ آہستہ آہستہ اس کے لبوں سے نکل رہا تھا۔ "بابا! مَیں ہی تیری اصغری ہوں۔ بابا!"

سورج ایک ابر پارے سے نکل کر انسانی کمزوری پر قہقہے لگا رہا تھا۔

اگست سنہ ۱۹۳۸ء

کتنا دہشتناک اعلان!

شہر کی تمام آبادی خوف سے لرز رہی تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور شاہی محل کے مزدوروں کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ مسلسل چھ ماہ سے حاکمِ شہر کے نئے عظیم الشان محل کی تعمیر جاری تھی۔ اور مزدور جانکاہ محنت کے ساتھ، اپنے ہمت شکن و حوصلہ فرسا کام میں مشغول تھے۔ کونسی سختی تھی جو اس مقہور و مظلوم مخلوقِ خدا پر نہیں ہوئی تھی؟ اور کونسا ظلم تھا جو اس بے کس و بدبخت گروہ پر نہیں کیا گیا تھا؟ طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک بڑے بڑے پتھروں کو زخمی شانوں پر اٹھا کر، کئی کئی منزل کا راستہ طے کرنا، انتہائی تھکاوٹ کے باوجود ایک لمحہ سستائے بغیر محل کی بلندیو

تک پہنچا، خون پسینہ ایک کر کے بھی ارباب لبست وکشاد کی جھڑکیاں، اپنے زخموں سے چور چور بدن پر کھانا، یہ تھا بدنصیب مزدوروں کا پروگرام اور اسی پروگرام پر وہ عمل کر رہے تھے۔ ان کے ذہن سے دن رات کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا؛ رات آرام کے لئے ہے مگر ان قسمت کے ماروں کو رات کے وقت بھی آرام کہاں؟ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چار پانچ گھنٹے انہیں آرام کرنے کی اجازت تھی۔ مگر وقت کا یہ قلیل ترین حصہ بھی نذرِ افکار ہو جاتا تھا۔

مسلسل فاقوں کے اژدہا نے اُن کا خونِ حیات چوس چوس کر انہیں ادھ مُوا کر دیا تھا۔ ان کے جسموں میں اب کیا تھا؛ محنت کی آگ سے برف کی طرح پگھلتی ہوئی ہڈیاں، جلے ہوئے درخت کی مانند سیاہ گوشت، اور ان ہڈیوں اور گوشت کے درمیان لرزتی ہوئی کانپتی ہوئی غمناک روح، ان کی زندگی کیا تھی؛ زندگی کا خواب پریشان! اور اس زندگی کا مقصد؛ ..... جابر حاکم شہر کے ہر اشارہ چشم و ابرو کو حکم ربانی سمجھنا۔ اور اس کی تعمیل میں اپنی جان تک دے دینا۔

نصف سال سے وہ شبانہ روز محنت میں غرق تھے۔ حاکم کے نمک حلال ملازم ان کو وحشیانہ زدوکوب کرتے۔ ہر قسم کی سختی روا رکھتے۔ یہاں تک کہ ان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی بھی نہ دیتے۔ کس لئے؛ تاکہ مزدور جلد کام ختم کر دیں۔ مگر یہ کام مزدوروں کے غم کی طرح بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر آنیوالا لمحہ مزدوروں کے لئے نئی مصیبت لا رہا تھا اور آج تو مصیبت کی انتہا ہو چکی تھی۔ شہر کی فضاؤں میں ایک انتہائی وحشتناک اعلان گونج رہا تھا۔ یہ اعلان کیا تھا؛ "حاکمِ شہر آج اپنے نئے محل میں تشریف لا رہے ہیں۔"

محل کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور حاکم شہر اپنے محل کو چھوڑ رہا تھا یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، شہر کے باشندے جانتے تھے کہ حاکم نئے محل میں منتقل ہوگا مگر یہ بات ان کے ذہن میں کبھی بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ ظالم اتنی جلد نئے محل میں آنے کا اعلان کر دیگا۔ وہ اتنی جلد شہر کی آرائش و زیبائش کیونکر کریں؟ حاکم کی خدمت میں نذر پیش کرنے کے لئے چمکتے ہوئے سکے کہاں سے لائیں؟ مزدوروں کو معلوم تھا۔ کہ جب محل تعمیر ہو جائے گا تو حاکم پرانا محل چھوڑ دے گا۔ لیکن ان کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ان کا ظالم آقا اس قسم کا وحشتناک اعلان کر دے گا۔ آخر ایک دن میں وہ محل کا بقیہ حصہ کیونکر تعمیر کردیں۔

والیٔ شہر کا ارادہ موت کی طرح اٹل اور پہاڑ کی طرح مضبوط تھا۔ رعیت کا عذر اس کے سامنے کیا وقعت و اہمیت رکھتا تھا؟ کس میں اتنی ہمت تھی کہ حاکم کو مشورہ دے۔ کون اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اس کے ارادے کو بدلنے کی کوشش کرے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ فاقہ کش رعایا کے روپے سے شہر کی آرائش و زیبائش ہونے لگی، بیکس و مظلوم ہستیوں کی آخری پونجی سامان آرائش پر خرچ ہونے لگی، اور مزدوروں کا کیا حال ہوا؟ یہاں کا تو عالم ہی اور تھا۔ نحیف و نزار مزدور ان کی عورتیں اور ان کے بچے محل کی تعمیر میں مصروف تھے۔ منتظمانِ محل کی خون آلود اور وحشت انگیز نگاہیں متجسسانہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں بید سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اور مزدوروں کا چمڑا ادھیڑا جا رہا تھا۔ بیکس مزدور زخموں سے چُور تھے۔ ان کی کمزور اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے خون بہ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے خون نکل رہا تھا مگر اس پر بھی بڑے بڑے پتھر اٹھائے چلے جا رہے تھے۔ کیا مجال کہ ایک لمحے کے لئے بھی ان کے قدم رُکیں۔ عورتیں موقعہ پاکر اپنے شیر خوار بچوں کو چھاتی سے لگا کر جلدی جلدی دودھ پلاتیں اور ابھی بچوں کے حلق سے دو چار قطرے ہی نیچے اترتے کہ ان مظلوم ہستیوں کی پیٹھ پر دھڑا

دھڑ بید پڑنے لگتے، وُہ روتے ہوئے، چیختے ہوئے بچوں کو وہیں چھوڑ کر پھر کام میں مشغول ہو جائیں۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا؟

سردی اس بلا کی تھی کہ الامان والحفیظ! مگر مزدوروں کو اس سردی سے کیا، حاکم شہر اور اس کے "نمک حلال" ملازموں کی نگاہوں میں مزدوروں کے جسم، انسانی جسم نہیں تھے۔ مزدوروں کی زندگی کا مقصد تو موسم کے تمام اثرات سے بالکل بے نیاز ہو کر مشین کی طرح کام کرنا ہے۔ اگر وہ سردی و گرمی سے متاثر ہونے لگیں، تو پھر ان کے اور دوسرے لوگوں کے جسموں میں کیا فرق رہ جائے؟

مزدور برابر کام میں منہمک تھے۔ محل اور شہر کی آرائش کا منتظم اعلیٰ 'جابر خاں' ہاتھ میں مضبوط بید پکڑے مزدوروں میں پھر رہا تھا۔ زخمی بازو اور زخمی ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی کام کی رفتار میں اور تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ شہر کی رپورٹ برابر 'جابر' کے کانوں تک پہنچائی جا رہی تھی، وہ بے حد مسرور تھا کہ اس کی کوششیں بر آور ہو رہی ہیں۔ شہر دلہن کی طرح سجایا جا رہا ہے۔ لوگ اپنی آخری پونجی بھی آرائش کی نذر کر رہے ہیں۔

جابر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دے دیا کہ لوگوں پر ہر قسم کا ظلم کریں۔ جو آرائش میں حصہ نہ لے اسکی کھال ادھیڑ دیں اور یہ سکیم پوری طرح کامیاب ہو رہی تھی۔

مزدور رات سے کام کر رہے تھے۔ وہ پہلے ہی فاقوں سے نڈھال تھے۔ اور اب تو محنت شاقہ کی بدولت ان میں مزید محنت کی طاقت نہیں تھی۔ جب پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ہاتھ کیونکر کام کریں؟ جابر کے پاس بار بار شکایت جا رہی تھی۔ کہ مزدور بھوکے ہیں۔ مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی جو بھی شکایت کرتا اس کا جسم ادھیڑ دیا جاتا۔ نصف دن گزر گیا تھا اور اس دوران میں کام کرنے والوں کے پیٹ میں ایک دانہ تک نہ گیا۔ معصوم بچے بھوک سے تڑپ

رہتے تھے۔ ماؤں کی چھاتیاں قریباً سوکھ گئی تھیں اور ظلم پر ظلم یہ کہ وہ سوکھی ہوئی چھاتیوں سے بھی اپنے بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کو نہیں لگا سکتی تھیں۔ جابر گرجتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:۔

"آج بادشاہ سلامت محل میں آ رہے ہیں۔ اگر محل تیار نہ ہوا۔ تو تمام مزدوروں کو ان پتھروں کے نیچے کچل دیا جائے گا۔ کام کرو پھر آرام ہی آرام ہے۔"

مگر بھوکے انسان کام کیونکر کریں؟ ان کے بازوؤں میں سکت کہاں؟ ان کے بازوؤں میں طاقت کہاں؟؟ بید مار مار کر جابر کے بازو تھک گئے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کے ظلم و ستم میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو اجازت دے دی تھی کہ مزدوروں کو بغیر کسی اندیشے کے زدوکوب کریں۔ کئی مظلوم مزدور بیہوش پڑے تھے۔ مگر اب بھی اُن کے جسموں پر بید پڑ رہے تھے۔

صمدو بھی مزدور تھا مگر پڑھا لکھا۔ مزدوروں میں اس کی ذات کو خاص اہمیت حاصل تھی اور وہ اسی کی وساطت سے اپنے مطالبات اپنے آقاؤں کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ اس دن وہ بار بار ملتجیانہ نگاہوں سے صمدو کو دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ سب حیران تھے۔ کہ ان کا پُرجوش رہنما آج کیوں خاموش ہے؟ کیوں ان کی ترجمانی نہیں کرتا صمدو کی بیوی بھی اپنے شوہر کی اس روش پر متعجب تھی۔

"ہم بھوکے مر جائیں"؟ ایک مزدور نے صمدو کے قریب آ کر کہا۔

یکایک فضا میں کرخت آواز گونجی۔ اور اس بیچارے کی پشت پر بید پڑنے لگے۔

"تم بھوکے نہیں مرو گے مگر اس طرح ضرور مرو گے۔" جابر بید مار مار کر کہنے لگا۔ صمدو اب بھی خاموشی سے کام کر رہا تھا۔ مزدوروں کو یقین ہو گیا کہ صمدو جابر کے ساتھ مل گیا ہے۔

ورنہ اس کی خاموشی واطمینان کی وجہ کیا ہے ؟ یہ خبر صمدو کے کان میں پہنچی۔ اس نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ جابر محل کے اوپر جا کر کام کرنے والوں کے کام کا معائنہ کر رہا تھا۔ تمام مزدور صمدو کی طرف دیکھنے لگے۔

"کام کیوں نہیں کرتے ؟" صمدو نے بلند آواز میں مزدوروں سے پوچھا۔

"مر جائیں گے ؟" تین چار مزدوروں نے بیک آواز کہا۔

"تو مر جاؤ ! کون کہتا ہے تم زندہ رہو" صمدو نے کہا اور ایک طرف چلا۔ یکایک اس کے کان میں آواز آئی "ابا !" اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ننھا لڑکا درخت کے نیچے ہاتھ میں درخت کے پتے پکڑے کھڑا تھا۔ صمدو ٹھہر گیا۔ ننھا لڑکا بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔

"ابا بھوک !" بچے نے کہا۔

"تو میں کیا کروں ؟" صمدو نے غصے سے کہا۔ بچہ سہم کر باپ کو دیکھنے لگا۔ نہ معلوم صمدو کے دل میں کیا آئی۔ کہ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

"منو ! تم ہاتھ میں کیا پکڑے ہو ؟"

"پتے ہیں ابا !" بچے نے جواب دیا۔

"کیوں پکڑ رکھا ہے انہیں ؟"

"ابا یہ درخت سے گر پڑے اور میں نے انہیں اٹھا لیا۔ ابھی یہ گر رہے ہیں..... بہت سے گر رہے ہیں..... ابا یہ کیوں گرتے ہیں ؟"

"ہوا انہیں گرا دیتی ہے ؟" باپ نے کہا۔

"ابا ہوا پتوں کو گرا دیتی ہے ، مگر درخت کو کیوں نہیں گراتی ؟" بچے نے سوال کیا۔

"آندھی درخت کو بھی گرا دیتی ہے۔"

"آندھی سے پہاڑ بھی گر پڑتے ہیں ابا؟"

"نہیں متو! آندھی پہاڑوں کو نہیں ہلا سکتی!"

"کیوں؟"

"کیونکہ......" ابھی صمدو کے منہ سے ایک لفظ ہی نکلا تھا کہ "شڑاک" کی آواز آئی۔ صمدو جلدی سے بچے کو اتار کر اپنی پیٹھ ملنے لگا۔ قہر و غضب کا طوفانی جذبہ اس کے دل و دماغ سے ٹکرایا۔ ٹکرایا، اور پھر مزدورانہ بے کسی کے احساس میں تحلیل ہو گیا۔

"اسی طرح کام کیا جاتا ہے بدبخت!" جابر نے اس کی ٹانگوں پر بید مارتے ہوئے کہا۔

"حضور! میں تو کام کر تا رہا ہوں اور......"

"یہ کام کر رہے ہو یا لونڈے کو گود میں اٹھائے سیر کر رہے ہو!"

"حضور!" صمدو آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیوں فیروز! یہ کب سے یہاں ہے؟" جابر نے ایک مزدور سے مخاطب ہو کر کہا۔

"حضور! یہ ہم سب سے زیادہ کام کرتا ہے...... حضور!" فیروز نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"بکواس! جھوٹ! تم لوگوں نے مجھے بہت ستا رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم سب کو پھانسی لگا دوں، اتنا دن بیت گیا اور ابھی کام کا وہی حال ہے۔ ذرا شہر میں جا کر دیکھو۔ بڑوں کا تو کیا ذکر، بچوں کو بھی کھانے پینے کا دھیان نہیں ہے۔ لوگ مشینوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ مگر تم...... ذلیل انسان!" یہ کہتے ہوئے جابر نے دو تین بید صمدو کے جسم پر لگا دیئے!

"مگر ہم بھوکے ہیں" صمدو نے کہا۔

"بھوکے"! جابر نے گرج کر کہا۔ "جب تک کام ختم نہیں ہو گا۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی چھٹی نہیں مل سکتی"۔

"ہم بھوکے مر جائیں گے۔" صمدو بولا۔

"مرو یا زندہ رہو مجھے کیا؟ میں بادشاہ سلامت کے آنے سے پیشتر مکمل محل دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"تو پھر محل جادو کے ذریعے سے مکمل ہو گا؟" صمدو نے کہا۔

"اتنی جرأت؟" جابر گرج کر بولا۔ صمدو خاموش رہا۔

"گویا تم کام کرنا نہیں چاہتے؟" جابر نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھوکے رہ کر کام نہیں ہو سکتا۔"

جیسے ہی صمدو کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ جابر کی آنکھیں غصے سے خون آلود ہو گئیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ اور مزدور کو خونخوارانہ دیکھنے لگا۔

"صمدو! آج تمہاری موت آئی ہے شاید"۔

"موت آ جائے تو ان دکھوں سے نجات نہ ملے"۔

"ایک حقیر مزدور کی اتنی جرأت!" جابر غصے سے آگ بھبوکا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دس بارہ سپاہی بید ہاتھوں میں پکڑے وہاں پہنچ گئے۔

اس بدبخت کو ستون سے باندھ کر سزا دو۔" جابر نے صمدو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تمام مزدور کام چھوڑ کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی جابر نے ان کی یہ حالت دیکھی وہ بے رحمانہ انہیں پیٹنے لگا۔ مزدور کام میں مصروف ہو گئے۔ سپاہی صمدو کو پکڑ کر ایک آہنی ستون کے

پاس لے گئے۔ اسے ستون کے ساتھ رسوں سے کس کر باندھ دیا۔ اس کے سر پر بڑا سا پتھر رکھ دیا اور بید وں سے اس بدنصیب کی کھال ادھیڑنے لگے۔ صمدو کی بیوی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچی۔ اور سپاہیوں کی منت سماجت کرنے لگی۔ اس کے جواب میں ایک بید اس کے سینے پر لگا۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ اور اپنے شوہر سے چمٹ گئی۔ سپاہیوں نے جابر کی طرف دیکھا۔ جابر نے بے پروائی سے اپنا سر ہلایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ظالم بید نحیف و نزار جسموں پر برسنے لگے۔ مظلوم عورت نے مزدوروں کی جانب اس انداز سے دیکھا۔ کہ ان کی رگوں میں غیرت جوش مارنے لگی۔ انہوں نے کام چھوڑ دیا اور تمام کے تمام ستون کی طرف چلے۔ سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ تین مزدوروں نے آگے بڑھ کر صمدو کو ستون سے آزاد کر دیا۔ آزاد ہوتے ہی وہ دھم سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ صمدو کا معصوم بچہ ابھی تک درخت کے نیچے سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بھی بھاگتا ہوا مجمع میں پہنچا اور ماں کو آوازیں دینے لگا۔ جابر نے سب کچھ دیکھا۔ اس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عجلت کے ساتھ وہاں پہنچ کر اس نے مزدوروں کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ مگر مزدور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ جابر کے دل میں مزدوروں کی طرف سے قدرے خوف پیدا ہوا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا اور سپاہیوں کو خاص اشارہ کر کے مزدوروں سے مخاطب ہوا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم بھوکے ...... روٹی ...... ظلم ..... بھوک ...... چھٹی!" اس قسم کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

"مگر کام تو ابھی ختم نہیں ہوا۔ بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں ...... دیکھو معاملہ نازک ہے۔ تم ......" جابر کی بقیہ آواز مزدوروں کے شوروغوغا میں ڈوب گئی۔

"کام کرو...... نہیں انعام دیا جائے گا!"

"بھوک...... چھٹی!"

یکایک ایک طرف سے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے ظاہر ہوئے۔ جابر کی آنکھیں خونخوار ہوگئیں۔ اس نے بید اُوپر اٹھایا۔ اور گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔" کام کرو، ورنہ تمہاری تکا بوٹی کر دی جائے گی۔"

مزدوروں کے دل میں جوش کا سمندر لہرانے لگا۔ مگر اس سے پیشتر کہ اس سمندر کی لہریں ظلم کی طرف بڑھیں۔ بے شمار اسپ سوار سپاہی ہاتھوں میں بید پکڑے وہاں پہنچ گئے مزدوروں پر سراسیمگی کا عالم طاری ہوگیا۔ جابر بید برسانے لگا۔ سپاہیوں نے بھی اس کی تقلید شروع کر دی۔

'صمد' کی مظلوم بیوی خون میں لتھڑے شوہر کے سرہانے بیٹھی تھی، اچانک اس کے کان میں اپنے معصوم بچے کی آواز آئی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھی اور اپنے لختِ جگر کو ڈھونڈنے لگی۔ گھوڑے مزدوروں میں سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ بیکس ہستیوں پہ بید برس رہے تھے ــــ زخمی مزدور فرش پر گر رہے تھے۔ دھڑم، دھڑم کی آوازیں ہائے ہائے کی آوازوں میں ڈوب رہی تھیں۔ خون کے چشمے ابل رہے تھے۔ ہر طرف ایسا گڑبڑ مچ گئی تھی۔ ماں کو ابھی تک اپنا بچہ نہیں ملا تھا۔ وہ گرتی پڑتی، لہولہان جسم پر بید کھاتی، بار بار پیشانی سے خون پونچھتی، اپنے لختِ جگر کو تلاش کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس کو بچہ نظر آیا۔ وہ برق رفتاری سے بچے کے پاس پہنچی اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ یکایک چار پانچ مزدور اس پر گرے۔ وہ سنبھل نہ سکی۔ اور بچے کو گود میں لئے گر پڑی۔ مزدور جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ بید برس رہے تھے۔ ماں نے چھاتی سے بچے کو چمٹایا ہوا تھا۔ مزدور اس پر سے گزر رہے تھے۔ ایک طرف سے سرپٹ

دوڑتے ہوئے گھوڑے آئے۔ اور ان دو مظلوم ہستیوں کو کچلتے ہوئے گزر گئے۔ ماں کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ بچے کا سر کچل گیا۔ ماں نے بچے کے کچلے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور دم توڑ دیا۔ بچے نے جلدی سے دو تین سانس لئے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہنگامہ ختم ہو گیا۔ مزدور پھر کام میں مشغول ہو گئے۔ محل کی عمارت بیکسوں کا خون حیات چوس چوس کر مکمل ہونے لگی جابر کے انتہائی ظلم و تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مزدور روٹی کا لفظ بھی زبان سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ تمام کے تمام جانکاہ محنت میں مصروف تھے۔

آخر محل مکمل ہو گیا۔ جابر کی باچھیں کھل گئیں۔ روٹیاں مزدوروں میں تقسیم ہونے لگیں بھوکے مزدور بے تحاشا روٹیوں پر گرے۔ اور پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔ متعدد زخمی مزدور خون میں تڑپ رہے تھے۔ مگر ان کی طرف کون توجہ کرتا۔ ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔

مزدور پھر کام میں منہمک ہو گئے۔ محل کے دروازوں اور راستوں کو سجایا جانے لگا۔ ہوا کے تند جھونکے درختوں کے پتوں کو گرا رہے تھے۔ فضاؤں میں سیاہ بادل لہرا رہے تھے۔ سورج کبھی ظاہر ہو جاتا تھا اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

جابر، سپاہی اور مزدور شاہی جلوس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ چند تھکے ماندے مزدور گھروں کو روانہ ہوئے۔ اور باقی جابر کے ساتھ رہے۔ زخمی مزدور اٹھنے لگے۔ صمد بھی اٹھا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں اپنی بیوی اور بچے کی لاشوں پر پڑیں۔ اس کے سامنے تاریکی کے بادل لہرانے لگے۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں لاشوں پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ مگر چند ہی لمحوں میں اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس نے سر اٹھا کر محل کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ وہ

ناخنوں سے فرش کو کریدنے لگا۔ اس کی رگ رگ میں اضطراب کی لہریں تڑپنے لگیں۔ اور دل کی گہرائیوں میں غصہ وغضب کا تلاطم برپا! اتنے میں ایک گرم ہاتھ اس کے پہلو سے لگا۔ صمدو نے مڑ کر دیکھا۔ فیروز اس کے پہلو میں، خون میں شرابور پڑا تھا۔ صمدو نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"فیروز!" صمدو نے کہا۔

فیروز کے لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک ہلکی سی آواز پانی کہتی ہوئی تھرتھرائی۔ صمدو اٹھا اور ندی کی طرف تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔ اور چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ زخمی مزدور کے منہ پر پانی کی بوندیں ٹپکا رہے تھے۔ فیروز کو کچھ دیر کے بعد ہوش آ گئی وہ اٹھا اور اٹھتے ہی لاشوں کو دیکھا۔

"ظلم کی انتہا ہو چکی فیروز!" صمدو نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں" فیروز کے منہ سے نکلا اور وہ بچے کے ننھے سے ہاتھ کو اٹھانے لگا۔ بچے کی مٹھی میں دو تین پتے نظر آ رہے تھے۔ صمدو کی آنکھیں اور سرخ ہو گئیں "ظلم کی آندھی ہمیں درخت کے حقیر پتوں کی طرح اڑاتی رہی۔ اور ہم بزدل اس آندھی کا مقابلہ کر سکے۔"

"لیکن آندھی اور پتوں کا مقابلہ؟" فیروز نے کہا۔

"قصور ہمارا ہے۔ ہم درخت کے پتے کیوں بنے۔ پہاڑ کیوں نہ بنے؟"

"ہماری قسمت!"

"قسمت ...... قسمت کیا؟ یہ ہمارا قصور ہے ...... ہم نے سب کچھ کھو دیا۔ مگر اب... اب ....." فرطِ غم و غصہ سے صمدو آگے نہ بول سکا۔

فیروز اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ صمدو بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال دیں۔ چند لمحے گزر گئے۔

"موت ..... مگر اس سے پہلے انتقام"۔ صمدو نے اپنے ساتھی کے ہاتھ کو زور سے دباتے ہوئے کہا۔ فیروز نے زور سے سانس کھینچا۔ اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

شاہی جلوس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر محل سے دُور صمدو اَور فیروز زخمی مزدوروں کو پانی پلانے، اور اُن کے زخموں پر پٹیاں باندھنے میں مصروف تھے۔

حاکم شہر کا جلوس شاہانہ کروفر، خدم و حشم کے ساتھ آراستہ و پیراستہ بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ والئ شہر کی گاڑی میں اٹھارہ اسپانِ تازی جتے ہوئے تھے۔ اور وہ اُمرا کے درمیان حاکمانہ غرور و تمکنت کے ساتھ، سونے کے تخت پر جلوہ فگن تھا۔ شاہی گاڑی کے ارد گرد حکامِ شاہی کی گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ ہر ایک افسر کا چہرہ اس جاہ و جلال، اس عظمت و برتری کے احساس سے سرخ تھا۔ اور حاکم کی نگاہیں اِدھر اُدھر اس تحکمانہ انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ گویا زمین کے ذرّوں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک جو کچھ ہے۔ اسی کی حکومت میں ہے۔ رعیت کے بدنصیب افراد، جھک جھک کر اپنے والئ نعمت کو سلام کر رہے تھے۔ بگل کی خوش آئند آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

حاکم کا جلوس بڑھا چلا جا رہا تھا۔ ایک تو حاکم کا شخصی دبدبہ و طنطنہ اور پھر جلوس کی یہ شان، رعایا کا کوئی شخص ایسا نظر نہ آتا تھا۔ جس کی نگاہیں مبہوت و ششدر، متاثر و مرعوب نہ ہوں۔ اور جس کے دل میں اپنے آقا کی عظمت و حشمت، جبروت و سطوت کا خیال پیدا نہ ہو گیا ہو۔

اب جلوس اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں سے عظیم الشان محل کے کنگرے صاف نظر آرہے تھے حاکم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ افسروں کی نگاہیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ رعایا کے لبوں پر بھی تبسم ظاہر ہوا مگر یہ تبسم روکھا پھیکا اور افسردہ تھا۔ بگل پر بگل بجائے جا رہے تھے۔ فوجی ترانے گونج رہے تھے مسرت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یکایک گاڑی کے پہیے خود بخود رک گئے لوگوں کی متحیر نگاہوں نے دیکھا کہ پہیوں سے انسانی پیکر چمٹے ہوئے ہیں ایک ہنگامہ پیدا ہوا، اچانک سیاہ بادلوں کی طرح انسانوں کا ہجوم اٹھا اور شاہی گاڑی پر حملہ آور ہو گیا۔ خدام کی تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ یکایک حاکم شہر کے پاس صمدو کے ہاتھ میں تیغ چمکا۔ اور دوسرے لمحہ میں حاکم کی گردن نصف سے زیادہ کٹ گئی "صمدو" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجی۔ صمدو نے دوسرا وار کیا اور حاکم کی گردن کٹ کر گر پڑی۔ خدام کی تلواریں صمدو اور دوسرے مزدوروں کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے، سپاہیوں کی عریاں تلواریں بے رحمانہ لوگوں کا خون چوسنے لگیں۔ ہر طرف محشر برپا ہو گیا۔ بغاوت کی وہ چنگاریاں جو مدت سے رعایا کے دل کی گہرائیوں میں سلگ رہی تھی۔ اب ظالم حاکم کے اس انجام کو دیکھ کر آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں، حاکم کے مرصع تاج کے جواہرات اور موتی بھوکی رعایا کے پاؤں کے نیچے خاک میں ملنے لگے۔ آرائش و زیبائش کا سامان ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ افسروں نے ہر مرعوب کن چال چلی مگر اب انسانی غیض و غضب کے سمندر میں تلاطم آگیا تھا، کمزور بازوؤں میں بجلیوں کا سیلاب موجزن تھا۔

باغی انسانوں کا آتشیں طوفان محلوں سے، افسرانِ حکومت کی شاندار عمارتوں سے، شاہی قلعوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ٹکرا ٹکرا کر سب کو خاکستر بنا رہا تھا۔ آناً فاناً فضا کی وسعتوں میں ایک سیاہ بادل نے افسردہ رُو سورج کو نگل لیا ہر طرف تاریکی چھا گئی اور اس ہیبت ناک تاریکی میں صرصرِ بغاوت کے آتش بار جھونکے ظالم حکومت کو خس و خاشاک کی طرح جلا رہے تھے۔